خطبات

حصہ چہارم

از

حضرت علامہ سید محمد رضی مجتہد

ناشر

ادارۂ نشر علوم دینیہ

خُطبات

حصّہ چہارم

علامہ سیّد محمّد رضی مجتہد

ناشر:- ادارۂ نشرِ علومِ دینیہ
فیڈرل بی ایریا - کراچی

جملہ حقوق بحقِ ادارۂ نشرِ علوم د…

نام کتاب — "خ…

طبع دوم —

تعداد —

ناشر — ادارۂ…

مطبع — ایجولی شا…

مُصنّف

علامہ سیّد محمد رضی…

پتہ

ادارۂ نشرِ علوم دینیہ…

سی ٩٦ بلاک نمبر ١٠ فیڈرل بی ایریا کراچی

فون نمبر: 683025

فہرست مضامین

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر	نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
۱	رسول اللہ صلعم بحیثیت معلم	۵	۱۶	معاشی تفاوت اور اسلام	۱۱۸
۲	صاحب سیف و قلم	۱۳	۱۷	حُبّ رسول ص	۱۲۷
۳	حضرت علیؑ کی شخصیت	۲۰	۱۸	احترام قرآن	۱۳۱
۴	کلام امیر المومنین حضرت علیؑ	۲۷	۱۹	کتاب و حکمت	۱۳۶
۵	کلام امیر المومنین حضرت علیؑ سے اقتباس	۳۴	۲۰	اتحاد و تنظیم	۱۴۴
			۲۱	رمضان اور نزول قرآن	۱۵۱
۶	فضیلت قرآن حکیم	۴۳	۲۲	بندگی ایک نعمت ہے	۱۵۵
۷	اللہ کی رسی سے مراد قرآن کی روشنی میں!	۴۸	۲۳	خدا فراموشی کا نتیجہ خود فراموشی ہے	۱۶۳
۸	اُخوّت اسلامی	۵۷	۲۴	علم کی فضیلت	۱۷۰
۹	اُمید و نا اُمیدی	۶۶	۲۵	اسلامی معیشت	۱۷۷
۱۰	صدق و اخلاص	۷۴	۲۶	ذکر اللہ کی کثرت	۱۸۷
۱۱	نیّت اور عمل	۸۴	۲۷	لیلۃ القدر اور ماہ رمضان عظمت و برکت اور رحمت و سعادت کے لیل و نہار	۱۹۱
۱۲	صفائی اور پاکیزگی	۹۳			
۱۳	حُجرۂ نبوی اور بیت فاطمہؑ	۹۹			
۱۴	حضرت ابوذر غفاری رض	۱۰۴	۲۸	روزہ اور تزکیۂ نفس	۱۹۹
۱۵	قدرتی وسائل رزق سے استفادہ	۱۱۱	۲۹	فطرے کی اہمیت	۲۰۲
			۳۰	حصول علم میں دیانت	۲۰۷

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر	نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
۳۱	حاجتمندوں کے حقوق	۲۱۴	۴۳	نیکی نجات کا راستہ ہے	۳۰۶
۳۲	خود اعتمادی	۲۲۱	۴۴	مقامِ انسانیت	۳۱۳
۳۳	نیک سلوک	۲۲۵	۴۵	کسی خبر کو سُن کر اس سے اثر لینے سے قبل اس کی جانچ کر لو۔	۳۲۲
۳۴	رحم و مہربانی	۲۲۸			
۳۵	احسان	۲۳۲			
۳۶	عبادت کا وسیع مفہوم	۲۴۰	۴۶	رواداری	۳۲۸
۳۷	تجارت کے اسلامی اصول	۲۴۸	۴۷	خودسپردگی	۳۳۸
۳۸	چور بازاری	۲۵۶	۴۸	اسلام میں مرکزیت کی اہمیت	۳۴۵
۳۹	کفایت شعاری	۲۶۶			
۴۰	عدلِ اسلامی	۲۷۷	۴۹	گروہ بندی	۳۵۲
۴۱	مثالی معاشرہ	۲۸۵	۵۰	جزیہ	۳۵۸
۴۲	حیاداری	۲۹۵		★	

علامہ سید محمد رضی مجتہد

کی تصنیفات

کی مکمل فہرست طلب فرمائیے:۔ مینجر ادارۂ نشرِ علومِ دینیہ سی ۹۶ بلاک ۱۰ الف
فیڈرل بی ایریا۔ کراچی
فون نمبر:۔ 683025

۵

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بحیثیت معلم

"اللہ ہی کی ذات ہے جس نے "اُمّی" لوگوں میں اُن ہی میں سے ایک ایسا رسول بھیجا جو اُن کے سامنے اللہ کی آیتوں کی تلاوت کرتا ہے اور ان کے نفسوں کو پاک صاف کرتا ہے۔ اور انھیں اللہ کی کتاب اور عقل و دانائی کی تعلیم دیتا ہے۔ اگرچہ وہ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی تھے۔"

یہ ہے ترجمہ سورۂ جمعہ کی ایک آیت کا جس میں اللہ نے ان بنیادی مقاصد کی طرف اشارہ فرمایا ہے جن کے لیئے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دنیا میں بھیجا گیا۔

یعنی آیاتِ الٰہیہ کی تلاوت، انسانی کردار کی تطہیر اور کتابِ خداوندی اور حکمت و دانائی کی تعلیم۔ اور یہی وہ حقیق اور اصلی باتیں ہیں جو کسی انسان کو بہترین معلم ثابت کر سکتی ہیں اور جو پورے کمال کے ساتھ سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں موجود تھیں۔

نسلِ انسانی میں ان لوگوں کا وجود ہر زمانہ میں پایا گیا ہے جو خود بھی "علم" رکھتے تھے۔ اور اپنے علم سے دوسروں کو فائدہ اٹھانے کا موقع دیا کرتے تھے یعنی وہ عالم بھی تھے اور معلم بھی تھے۔ ایسے لوگوں کی بیشمار قسمیں تھیں مگر مجموعی طور پر ان کو دو طرح کے گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ ایک وہ گروہ جس کی تعلیم اور جس کے علوم صرف اپنی ذاتی فکر و نظر سے تعلق رکھتے تھے اور دوسرا وہ گروہ تھا جسکے علوم اور جس کی تعلیم کی بنیاد آسمانی ہدایات اور احکام خداوندی اور وحی و الہام پر تھی۔ پہلے گروہ کا تعلق چونکہ فلسفہ اور فکر و نظر ہی سے تھا اس لیئے اُس کے پاس یا تو عملی پہلو سرے سے تھا ہی نہیں یا صرف برائے نام تھا۔ ایسے معلّمین اور مصلحین، فلاسفہ اور حکماء کہلاتے تھے۔ اس کے برخلاف دوسرے گروہ کے پاس علم کے ساتھ عمل بھی تھا اور جس بات کی وہ دوسروں کو تعلیم دیتا تھا اس پر خود بھی عمل کرتا تھا اور اس کے تمام علوم اور اعمال اور فکر و کردار کی ٹھوس بنیاد حکم الٰہی اور آسمانی ہدایت تھی۔ اور دراصل یہی ایک بنیادی سبب ہے کہ فلسفیوں کی تعلیم نے فکر و نظر پر تو کچھ نہ کچھ اپنا اثر دکھایا لیکن انسانی ضمیر اور کردار اس سے متاثر

نہ ہوسکا۔ اس کے مقابلہ میں دوسرا گروہ جسے ہم انبیاءؑ و مرسلینؑ کہتے ہیں نوعِ انسان کو ہمیشہ فکری اور عملی دونوں حیثیتوں سے متاثر کرتا رہا لیکن اس گروہ میں بھی سب کی حیثیت اور مرتبہ برابر نہ تھا۔ انبیاءؑ کا یہ سلسلہ حضرتِ آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر سرکارِ دو عالم حضرت محمدِؐ عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ختم ہو گیا۔ اس پورے سلسلہ میں ہمیں ایک لاکھ چوبیس ہزار مصلحین ملتے ہیں جو سب کے سب نبی تھے اور کچھ ایسے بھی تھے جو کسی دوسرے نبی کی شریعت پر نہیں چلتے تھے بلکہ خود صاحبِ شریعت تھے حضورؐ انور کی ذاتِ اقدس سب کے آخر میں آئی اور اب قیامت تک کوئی نبی نہیں آئے گا۔ حضورؐ ہی کی شریعت آخری شریعت ہے اور یہی اب قیامت تک باقی اور جاری رہے گی۔ اس طرح گروہِ انبیاءؑ و مرسلینؑ میں سب سے افضل اور آخری معلّم سرورِؐ دو عالم کی ذاتِ انور و اقدس ہے۔ آپ کی تعلیم میں وہ تمام کمالات ایک جگہ پر جمع ہیں جس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔

جس آیت کا ترجمہ میں نے ابھی بیان کیا تھا اس میں حضورؐ کے کامل ترین معلّم ہونے کی طرف وضاحت کے ساتھ اشارے کئے

گئے ہیں ۔ اس میں پہلی بات جو بتائی گئی ہے وہ یہ ہے
کہ آپ الٰہی آیتوں کی تلاوت کرتے تھے۔ یعنی انھیں پڑھ پڑھ
کر سنا تے تھے ۔ اس کا مطلب یہی ہوا کہ حضورؐ کے علم کی بنیاد
وحی و الہام پر تھی اور جو کلام اللہ کی جانب سے آپ پر اترتا
تھا اس کو اصلی شکل و صورت میں یعنی اس کا اصلی
متن اور اس کے اصلی الفاظ آپ لوگوں کو پڑھ کر سنا دیا
کرتے تھے تا کہ تمام لوگ اس حقیقت سے آگاہ رہیں کہ آپ
جو کچھ بھی تعلیم دے رہے ہیں وہ خود اپنی طرف سے نہیں بلکہ اللہ
کی طرف سے اور اسی کے حکم سے تعلیم دے رہے ہیں ۔ پھر یہی نہیں
کہ آپ کلام الٰہی کے صرف پڑھنے ہی کو کافی سمجھیں بلکہ آپ اس
کلام کی پوری طرح وضاحت بھی فرما دیا کرتے تھے اور ساتھ
ساتھ آپ کی یہ بھی کوشش رہتی تھی کہ لوگوں کی سمجھ اور عقل و
فکر کا معیار بھی بلند ہوتا رہے تا کہ وہ کلامِ خداوندی کی گہری باتوں
کو بھی سمجھنے کے قابل ہو سکیں اور غفلت کے اندھیرے سے ابھر کر
فکر و دانش کے اجالے میں آ سکیں ۔ اس طرح ان کی فکری
سطح کو اونچا بھی کر دیا جائے اور وہ اس کلام کو اچھی طرح
سمجھ بھی لیں جو حضورِ انور ان کے سامنے پڑھیں اور انھیں

اس کا بھرپور یقین بھی ہو کہ یہ کلام کسی انسان کا نہیں بلکہ انسان اور تمام کائنات کے پیدا کرنے والے اللہ کا ہے اور جب یہ تمام منزلیں گذر جائیں تو سننے والوں کے ضمیر اور کردار کی اصلاح کا کام انجام دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں جب کسی شخص کو اس کا یقین کامل ہو جائے کہ وہ کلام جسے وہ سن رہا ہے وہ کسی بشر یا کسی اور مخلوق کا نہیں ہے بلکہ پوری کائنات کے خالق کا ہے پھر اس کا مطلب بھی پوری وضاحت کے ساتھ اس کی سمجھ میں آجائے اور اس کی فکری سطح اس قدر اونچی ہو جائے کہ اس کلام کا مطلب سمجھنے میں اسے کوئی دشواری نہ رہے تو لازمی طور پر اس کا دل، اس کا ضمیر اور کردار اس کلام اور اس کی ہدایت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اسی کے ساتھ یہ صفت کہ معلم جس بات کی دوسروں کو تعلیم دے اس پر خود بھی عمل کرے، طریقہ تعلیم کو بے انتہا مؤثر بنا دیتی ہے۔ یہ بات صرف انبیاء علیہم السلام ہی میں ملتی ہے۔ فلاسفہ میں نہیں ملتی اور انبیاءؑ میں بھی سب سے زیادہ کمال اور بلندی کے ساتھ حضورؐ انور کی ذاتِ اقدس

میں ملتی ہے۔ اس گفتگو سے ہم بہ آسانی یہ بات سمجھ سکتے ہیں کہ حضورِ انور کا کام صرف کلامِ خداوندی پڑھ کر سنا دینا ہی نہ تھا بلکہ اس کی تشریح اور ساتھ ہی شعور اور فکر میں بیداری اور بلندی پیدا کرنا اور عملِ پیہم اور سعیِ مسلسل کی تبلیغ کرنا بھی تھا۔ دوسرے لفظوں میں العیاذ باللہ حضورِ انور کی حیثیت صرف ایک قاصد، یا خط پہنچا دینے والے کی سی نہ تھی جو مکتوب الیہ تک صرف خط پہنچا دیا کرتا ہے نہ تو وہ خط کی عبارت سے واقف ہوتا ہے اور نہ اس عبارت کا مطلب جانتا ہے۔

سورۂ جمعہ کی اس آیت اور اسی طرح کی دوسری آیتوں میں صاف صاف بتا دیا گیا ہے کہ نبیٔ کریم کا کام ان کی گہرائیوں سے لوگوں کو باخبر کرنا بھی تھا۔ ساتھ ہی اس کام کو اس طریقہ اور اس انداز میں انجام دینا کہ ہر معیار اور ہر سطح کی سمجھ رکھنے والا انسان بات کو سمجھ سکے اور اس سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکے۔ پھر ان سب باتوں کے علاوہ ایک چیز جو تعلیمی طریقہ میں بے انتہا تاثیر پیدا کر دیتی ہے وہ یہ ہے کہ استاد اور معلّم کی اس صفت کے ساتھ ہی کہ وہ جن باتوں کی

دوسروں کو تعلیم دے رہا ہے ان پر خود بھی عامل ہو - اس کی پوری زندگی خواہ وہ نجی اور پرائیویٹ ہو یا علانیہ اور آشکارا ہو پورے طور پر عوام اور ان لوگوں کے سامنے موجود ہو جنہیں وہ تعلیم دے رہا ہے۔

سرورؐ کائنات کا یہ کام اور یہ مرتبہ کہ آپ صرف قاصد نہ تھے بلکہ مفسّر و معلّم بھی تھے اور کلام خداوندی کے اسرار و رموز کو بیان کرنے والے اور سمجھانے والے بھی تھے جس کے نتیجہ میں لوگوں کے لیئے فہم قرآنی کا معیار صرف وہی تشریح اور تبیین ہے جو حضورؐ انور نے فرمائی تھی اور وہی تعلیم و تفسیر ہے جو حضورؐ سے حاصل کی گئی ہے کیونکہ اللہ نے اپنے کلام کی تشریح و تبیین اور تعلیم کا منصب بنیادی طور پر حضورؐ ہی کے سپرد کیا ہے۔ چنانچہ قرآن کریم کے سورۂ النحل میں (آیت ۴۴) اللہ کا یہ ارشاد موجود ہے: وَاَنْزَلْنَا اِلَيْكَ الذِّكْرَ لِتُبَيِّنَ لِلنَّاسِ مَا نُزِّلَ اِلَيْهِمْ وَلَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ۔ اور ہم نے (اے رسول) تم پر قرآن حکیم کو اس لیئے نازل کیا ہے کہ تم سب لوگوں سے وہ باتیں بیان کر دو جو اُن کی ہدایت کے لیئے (تمہارے ذریعہ سے) بھیجی گئی ہیں اور اس لیئے کہ وہ غور و فکر سے کام لیں ، اس آیۂ کریمہ

نے صاف طریقہ پر اس حقیقت کو بتا دیا کہ حضورِ انور کی ذاتِ ارفع و اعلیٰ کلام الٰہی کے لیئے صرف قاصد ہی کی حیثیت نہیں رکھتی تھی بلکہ آپ اس کلام کے اصلی مفسّر اور حقیقی مُبیّن تھے اور ایسے معلّم تھے جن کی تعلیم نوعِ انسان کے ہر فرد کے لیئے قیامت تک ہر حیثیت سے اپنی آپ ہی مثال ہے چاہے وہ انسانی فرد ذہنی اور فکری سطح کا کوئی بھی معیار رکھتا ہو۔

صاحبِ سیف و قلم

اسلام کی تاریخ کا ایک انتہائی اہم باب وہ بھی ہے جس کا تعلق امام عالیمقام شاہِ خیبر گیر شیر خدا حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کی ذاتِ اقدس سے ہے۔ آپ کی ولادت سنہ ۳۰ عام الفیل مطابق سنہ ۶۰۰ء میں ہوئی تھی اس طرح سنہ ۴۰ ہجری مطابق سنہ ۶۶۱ء میں آپ کی شہادت کے وقت آپ کی عمر مبارک ہجری سنہ کے حساب سے ۶۳ سال کی تھی۔

سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی بعثت کے وقت آپ کی عمر دس سال کی تھی۔ بعثت رسولؐ کے بعد ۱۳ سال تک آپ آنحضرتؐ کے ساتھ مکہ ہی میں رہے اور حضورِ انور سے تربیت کا شرف حاصل کرتے رہے اور جب وقت جناب رسالتمآبؐ نے ہجرت فرمائی آپ کی عمر ۲۳ سال کے قریب تھی۔

علامہ ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں لکھتے ہیں:
"رَبَّاہُ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ مِنْ صِغَرِہٖ فَلَازَمَہٗ مِنْ صِغَرِہٖ فَلَمْ یُفَارِقْہُ اِلٰی اَنْ مَاتَ" یعنی سرورِ انبیاء نے آپ کے بچپنے کے زمانہ سے آپکی تربیت فرمائی پھر اسکے بعد آپ وقتِ وفاتِ رسول تک آنحضرتؐ سے جدا نہ ہوئے۔

انسانی تاریخ نے اب تک لاکھوں کروٹیں بدلیں اور اس کے اوراق پر بے شمار شخصیتوں کے نقوش ابھرتے رہے اور مٹتے رہے مگر زمانہ کی گردشوں کے طوفانی دھارے اُن عظیم ہستیوں کے نام مٹانے کی جراٴت نہ کرسکے جن کے بے مثال کارناموں اور بلند ترین کردار نے ان کو زندۂ جاوید اور غیر فانی بنا دیا ہے۔ ان کی مثالی زندگی ہر دور کی انسانی نسل کے لیئے مشعلِ ہدایت بنی رہے گی۔ انہوں نے ذہنِ قدیم اور ذہنِ جدید کے بہترین تقاضوں کو پورا کیا ہے اور انسانی شعور و بصیرت کو نئی پہنائیاں اور جدید وسعتیں بخشی ہیں۔

ایسے مثالی لوگ ہمیشہ تنگ اور محدود ماحول اور شخصی اور جماعتی تصورات سے اونچے ہوا کرتے ہیں اور اپنے مقناطیسی

کردار کی کشش کی وجہ سے پورے انسانی معاشرے کیلئے بے پناہ عقیدت اور محبت کا مرکز بن جاتے ہیں جس میں مکان وزمان کی قیدیں باقی نہیں رہا کرتیں۔

حضرت امیر المومنین علی ابن ابیطالب علیہ السلام بھی انسانی تاریخ کی ان بلند ترین اور مایۂ فخر و ناز شخصیتوں میں ایک ممتاز مقام رکھتے تھے۔ جنہوں نے اپنے زہد کا ناموں اور فکر و نظر کی بلندیوں کے ذریعہ انسانیت کو اسکے صحیح مقام اور مرتبہ سے روشناس کرایا ہے اور آپ کی سیرت اور آپ کی ہدایات اس کے لئے رہتی دنیا تک سرچشمۂ فلاح و نجات بنی رہیں گی۔ ایک صحتمند شعور اور معقول فکر رکھنے والے ذہن کو آپ کی مقدس زندگی اور پاک سیرت میں ہر وہ سامان مل جاتا ہے جو انسان کی بے چین اور بیقرار فطرت کے لیئے سکون و اطمینان کا وسیلہ ہے اور اس کے ہر مرض کا علاج ہے۔ آپ کی ذات ایک ہی وقت میں مختلف کمالات کا مجموعہ تھی۔ آپ ایک طرف میدان کارزار میں تلوار کے دھنی، بے مثال فاتح اور بے نظیر شہسوار تھے جس نے بڑے سے بڑے طاقتور دشمن کے سامنے سے کبھی منہ

نہیں پھیرا اور ہمیشہ موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر شجاعت کے جوہر دکھائے تو دوسری طرف آپ فلسفہ وحکمت علم ومعرفت اور سحر بیانی میں یکتائے روزگار تھے۔ آپ نے اپنے فصیح وبلیغ اور یادگار زمانہ خطبوں، مقالات، خطوط اور اشعار وغیرہ سے اسلام کے اس مقصد کی تکمیل فرمائی جو حضرت سیدالمرسلینؐ کی حیاتِ طیبہ کا حاصل تھا۔ آپ کے یہ خطوط عمّالِ حکومت کے نام بھی تھے اور دوسروں کے نام پر بھی۔ ان تاریخی خطبوں اور خطوط کو پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کے اندر علم وحکمت کے کتنے خزانے پوشیدہ ہیں۔ اور عقل ومعرفت اور فہم وبصیرت کے کتنے دریا موجزن ہیں جنکی گہرائی اور وسعت کا پتہ چلانا آسان کام نہیں ہے۔ آپ کے یہ خطبے اور تحریریں اصلاحِ کردار کے اعلیٰ مقصد کے ساتھ ہی مسلم معاشرے میں علمی ذوق کے پھیلنے کا بھی بہت بڑا وسیلہ ثابت ہوئیں اور آج تمام اسلامی علوم کی تدوین کے کام میں حضرتِ علیؑ مرتضیٰ کی ان علمی کاوشوں کے گہرے نقوش موجود ہیں۔ ان ہی خطوط میں جو آپ نے اپنے عمالِ حکومت کے نام تحریر فرمائے تھے وہ یادگار خط بھی ہے جو مالک اشتر کے نام

آپ نے (۳۷ھ میں) اس وقت تحریر فرمایا تھا جب انھیں آپ نے مصر کا گورنر مقرر کیا تھا۔ اس خط میں بڑی تفصیل کے ساتھ رعیت اور حاکم کے فرائض اور حقوق کو واضح فرمایا گیا ہے اور فرد و معاشرہ کے حدود کی تشریح کی گئی ہے۔ مملکت کے نظم و نسق کو صحیح طریقہ پر قائم کرنے، ترقی دینے اور مستحکم بنانے کے بہترین اصول اور ایسے ضابطے تعلیم دیئے گئے ہیں جو پہلے کی طرح آج بھی حرف آخر ہیں۔ اور جو لوگ اسلامی دستور حکومت کی کوئی مثال اپنے سامنے رکھنا چاہتے ہوں ان کے لیئے یہ مکتوب گرامی بڑی افادی اہمیت رکھتا ہے۔

حضرت علیؑ جہاں ایک عظیم خطیب اور لاثانی بہادر تھے اسکے ساتھ ہی اس تحریر سے اور آپ کے دوسرے ارشادات اور واقعات سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ انتظام مملکت میں بھی آپ کی نظر کسقدر گہری ہے۔ آپ انتہائی رحم دل تھے۔ حسنِ اخلاق کا مجسمہ تھے۔ سخاوت و زہد اور عبادت و ورع و تقویٰ اور صبر و استقلال میں اور تمام کمالات میں حضرت خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تربیت خاص

کا نمونہ تھے۔ بلاشبہ اسلام جنس انسانی برتری کی تعلیم دینے آیا ہے حضرت امیر المومنین علیؑ مرتضیٰ نے اپنی عملی زندگی سے اس کی کامیاب ترین مثال پیش فرمائی ہے۔ آپ نے علم دوستی، انسان دوستی، عدل و انصاف، خود اعتمادی، صبر و ہمت، خلق و مروت، محبت و وفا، حمایت حق اور شجاعت و بسالت کے وہ عدیم المثال نمونے پیش کیئے ہیں جو انسانی تاریخ کے سینہ پر نقشِ دوام بنکر ہمیشہ ثبت رہیں گے۔ اور اسلامی تاریخ اپنے اس عظیم فرزند پر ہمیشہ فخر و ناز کرتی رہے گی۔

حضرت شیرِ خداؑ بجا طور پر صاحب سیف و قلم تھے آپ کی علمی منزلت تو اسی بات سے ظاہر ہے کہ آپ کے معلّم خود حضرت خاتم الانبیاؐ تھے جنہوں نے آپ کی بچپنے سے تربیت فرمائی تھی اور یہ امر واضح ہے کہ جب معلّم وہ ہو جو ساری کائنات میں سب سے زیادہ کامل ہو تو شاگرد میں بھی اسی کے کمال کا عکس ہوگا اور اسی علمی مرتبہ کو بتانے کے لیئے پیغمبرؐ مدنی نے آپ کو باب مدینہ علم کا لقب عطا فرمایا تھا۔ اور آپ کے صاحب سیف ہونے پہ تو سارا اسلامی

غزوہ شاہد ہے۔ جنگ بدر سے لیکر عہد وفات رسولؐ تک کوئی بڑی لڑائی ایسی نہ تھی جس پر اسد اللّٰہی شجاعت کا نشان نہ ہو۔ میدانِ اُحد میں اسی شجاعت کی مدح میں ہاتفِ غیب نے "لَا فَتیٰ اِلَّا عَلِیؑ" کی آواز بلند کی تھی اور خیبر میں خود سرورِ کونینؐ نے شیرِ خدا کو علمِ لشکر عطا کرنے سے پہلے اس کا اعلان فرما دیا تھا کہ یہ وہ صاحبِ سیف علمدارِ اسلام ہے جو میدان سے کبھی فرار نہیں کرتا۔ محبوب خدا و رسولؐ ہے اور بغیر قلعۂ خیبر کو فتح کیئے واپس نہیں آئے گا۔

حضرتِ علیؑ کی شخصیت

امیرالمومنین حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام کی شخصیت مجموعی طور پر ایسے صفات اور کمالات کی حامل تھی جو کسی ایک انسان میں بیک وقت عام طور پر جمع نہیں ہوتے۔ میدانِ جنگ کا ایک قوی دل سپاہی جس کی تلوار سے دشمنوں کے خون کی بارش ہوتی رہتی ہو اور جس کے ذہن میں کٹے ہوئے سروں اور تڑپتی ہوئی لاشوں کے سوا کسی اور بات کا تصور ہی نہ ہو، وہ حکمت اور فلسفہ کے گہرے مسائل کی گتھیوں کو نہیں سلجھا سکتا مگر حضرت علیؑ کی ذات گرامی میں یہ صفتیں اپنے پورے کمال کے ساتھ موجود تھیں ان کی شجاعت اور بہادری کے لئے بدر و اُحُد و خیبر و خندق و حنین اور اسلام کی تمام بڑی اور چھوٹی لڑائیاں گواہی دیں گی کہ میدانِ جنگ نے اُن سے بہتر کوئی سپاہی نہیں دیکھا جس نے کبھی دشمن سے ڈر کر منہ نہیں پھیرا اور نہ کبھی شکست کھائی۔ انسانی تاریخ بہادروں اور شجاعوں کے کارناموں سے بھری پڑی ہے مگر ایسا

بہادر، ایسا سورما، ایسا مردِ میدان اور ایسا فاتح دنیا کی آنکھ نے حضرتِ علیؑ کے سوا نہیں دیکھا جس کی ساری جنگی زندگی فرار کے تصور سے خالی ہو اور جس نے کبھی دشمن سے نہ رحم وکرم کی بھیک طلب کی ہو اور نہ اُس کے خوف سے پناہ کی جگہ تلاش کی ہو۔ اس عدیم المثال شجاعت اور بہادری کے ساتھ آپ محرابِ عبادت کے شب زندہ دار نمازی تھے، علم وحکمت اور فلسفہ ومعرفت میں یکتائے زمانہ تھے اور تدبّر وسحر بیانی میں اپنی آپ ہی مثال۔

آپ کی ولادت ۳۰ عام الفیل مطابق ۶۰۰ عیسوی عین خانۂ کعبہ میں ہوئی۔ شاہ ولی اللہ نے علامہ حاکم کے حوالہ سے لکھا ہے: قَدْ تَوَاتَرَتِ الْاَخْبَارُ اَنَّ فَاطِمَۃَ بِنْتَ اَسَدٍ وَلَدَتْ عَلِیًّا فِیْ جَوْفِ الْکَعْبَۃِ، یعنی احادیث متواترہ سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ فاطمہ بنت اسد کے یہاں حضرت علیؑ کی ولادت عین کعبہ میں ہوئی تھی۔ آپ کی شہادت ۲۱ رمضان ۴۰ ہجری میں ہوئی۔ آپ کی عمر مبارک تقریباً ۶۳ سال تھی جب آپ کے سر اقدس پر مسجد کوفہ میں ضربت لگی تھی۔

علامہ ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں لکھتے ہیں: وَکَانَ رَبَّاہُ رَسُوْلُ اللّٰہِ مِنْ صِغَرِہٖ فَلَمْ یُفَارِقْہُ اِلٰی اَنْ مَاتَ۔ یعنی

آپ کو سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے آپ کے بچپنے ہی سے تربیت فرمایا تھا۔ پھر اس کے بعد آپ وقتِ وفاتِ رسولؐ اللہ تک کبھی ان سے جُدا نہ ہوئے۔ حضرت رسالتمآبؐ کی بعثت کے وقت آپ کی عمر دسؔ سال کی تھی اور ہجرت کے وقت تقریباً ۲۳ سال تھی۔ ظاہر بات ہے کہ جس عظیم بچہ کو ایسے عظیم اور انتہائی شفیق استاد کی تربیت کا شرف ملا ہو اور اُس بچہ میں اس معلّم کامل سے استفادہ کرنے کی اس کی پوری حدتک صلاحیت اور قابلیت موجود ہو جس کا کسی طرح بھی امکان ہوسکتا ہے تو اس کا یقینی نتیجہ سوائے اس کے کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ بچہؔ اپنے اُستاد کے تمام کمالات، صفات اور کردار کا آئینہ دار ہوگا۔ بس یہی حالت حضرتِ امیرالمؤمنین علی بن ابی طالب علیہ السلام کی بھی تھی کہ وہ سرورِ کائنات کے خُلقِ عظیم، علم و معرفت، شجاعت و حکمت، تدبّر و استقلال، سخاوت و عبادت، عزم و ہمت، عدل و انصاف اور زہد و تقویٰ نیز دوسرے صفات و کمالات میں اُن کی حیاتِ طیّبہ کا بہترین نمونہ تھے۔ بعثتِ رسولؐ کے بعد مَردوں میں سب سے پہلے آپ ہی کو سرورِ کائنات کے ساتھ نمازِ جماعت میں شریک ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ آپ نے اپنی پوری زندگی میں ایک لمحہ کے لئے

بھی بتوں کے سامنے سر نہیں جھکایا - آپ حضرتِ رسالتمآبؐ کی چہیتی بیٹی حضرتِ فاطمۃؑ الزہراءؑ کے شوہر اور امام حسنؑ اور امام حسینؑ جیسے سرمایہ روزگار فرزندوں کے والد تھے - شبِ ہجرت آپ سرورِ کائنات کے بستر پہ سوئے اُس وقت جب چاروں طرف خون کے پیاسے دشمنوں کا نرغہ تھا -

ہجرت کے بعد جب رسولؐ اللہ نے مدینہ میں آکر ایک کو دوسرے کا بھائی بنایا تھا تو حضرت علیؑ کے لیئے فرمایا تھا "اَنْتَ اَخِیْ فِی الدُّنیَا وَالْآخِرَۃِ" اے علیؑ تم دنیا و آخرت میں میرے بھائی ہو - آپ ہی سرورِ کائنات کے ہمیشہ علمدار رہے چنانچہ تاریخ طبری وغیرہ میں لکھا ہے - حضرت علیؑ فرمایا کرتے تھے کہ جنگ احدؔ میں میرے ہاتھ میں زخم لگنے سے علم گر گیا تھا تو آنحضرتؐ نے فرمایا کہ علم کو علیؑ کے بائیں ہاتھ میں دیدو کیونکہ یہ دین و دنیا میں میرا علمدار ہے - بہادری کے ساتھ نرم دلی اور رحم و کرم آپ کی شجاعت کے مخصوص اصول ہیں دشمن پہ پوری طرح قابو پاکر اس کے ساتھ حُسنِ اخلاق اور نرمی سے پیش آنا اور اپنے مغلوب حریف کے ساتھ ہمدردی کرنا آپ کے محاسنِ اخلاق کی بلندی کا پورا ثبوت ہیں -

آپ نے ہمیشہ ایک غریب انسان کی طرح زندگی بسر کی اور

دوسروں کو بھی انتہائی سادہ زندگی گزارنے کی تلقین کرتے رہے۔ اپنے دورِ حکومت وخلافت میں آپ کو بصرہ کے گورنر عثمان بن حنیف کے متعلق شکایت ملی کہ انھوں نے شہر کے رئیسوں اور مالداروں کی دعوت میں شرکت کی جہاں غریبوں کو نہیں بلایا گیا تھا۔ یہ خبر ملتے ہی آپ نے گورنر کو تحریر فرمایا۔

"مَا ظَنَنْتُ اَنَّکَ تُجِیْبُ اِلٰی طَعَامِ قَوْمٍ عَائِلُھُمْ مَجْفُوٌّ وَغَنِیُّھُمْ مَدْعُوٌّ" مجھے اس کی توقع نہ تھی کہ تم ایک ایسی جماعت کی دعوتِ طعام قبول کرلوگے جہاں غریبوں کو نظر انداز کیا گیا ہے اور امیروں اور دولت مندوں کو بلایا جاتا ہے۔ ہر ماموم اور محکوم کے لئے ایک امام اور حاکم ہے جس کی وہ پیروی کرتا ہے۔ "اَلَا وَاِنَّ اِمَامَکُمْ قَدِ اکْتَفٰی مِنْ دُنْیَاہُ بِطِمْرَیْہِ وَمِنْ طُعْمِہٖ بِقُرْصَیْہِ" تم کو معلوم ہونا چاہیئے کہ تمہارے امام نے اپنی دنیا سے اپنے پہننے کے لئے صرف دو پرانے کپڑے حاصل کیئے ہیں اور غذا کے لیئے محض دو سوکھی روٹیاں۔ اَلَا وَاِنَّکُمْ لَا تَقْدِرُوْنَ عَلٰی ذَالِکَ وَلٰکِنْ اَعِیْنُوْنِیْ بِوَرَعٍ وَاجْتِھَادٍ وَعِفَّۃٍ وَسَدَادٍ،، آگاہ ہو جاؤ کہ تم یقیناً اس حد تک نہیں نہیں کر سکتے مگر کوشش تو کرو اور جس قدر بھی دنیا داری سے بچنا ممکن ہو بچنے کی سعی سے غفلت نہ کرو اور اپنے اس عمل اور

کوشش سے میری مدد کرو۔ میں نے تمہاری دنیا میں سے سونے کے ٹکڑے جمع نہیں کیئے اور نہ اس کے ذخیروں میں سے دولتیں اکٹھا کی ہیں، اگر میں چاہتا تو دنیا کے شہد تک رسائی حاصل کر سکتا تھا مگر یہ بات میری طبیعت سے بہت دور ہے کہ نفسانی خواہش مجھ پر غالب آسکے اور حرص و ہوس مجھے اس پر مائل کر سکے کہ میں اچھی اچھی غذاؤں اور عمدہ کھانوں کے انتخاب میں مشغول ہو جاؤں جبکہ ملک میں ایسے محتاج اور غریب لوگ بھی موجود ہوں جنہیں ایک وقت کی روٹی بھی میسر نہ ہو یا میں پیٹ بھر کر رات گزار دوں اور میرے گرد و پیش کچھ بھوکے شکم ہوں اور پیاس سے جلتے ہوئے جگر موجود ہوں۔

اَاَقْنَعُ مِنْ نَفْسِیْ بِاَنْ یُّقَالَ اَمِیْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَلَا اُشَارِکُھُمْ فِیْ مَکَارِہِ الدَّھْرِ اَوْ اَکُوْنَ اُسْوَۃً لَّھُمْ فِیْ جُشُوْبَۃِ الْعَیْشِ۔

کیا میں اس بات پر قناعت کر لوں کہ مجھے مومنوں کا امیر کہہ کر خطاب کیا جائے اور میں زمانہ کی مصیبتوں میں مسلمانوں کا شریک حال نہ بنوں اور نہ زندگی کی سختیوں میں اُن کے سامنے اپنی زندگی کو مثال بنا کر پیش کروں میں اس حیوان کی طرح ہرگز نہیں پیدا ہوا ہوں جس کی پوری

کوشش صرف یہ رہتی ہے کہ وہ اپنا چارا تلاش کرلے بلکہ میری خلقت کی غرض اس سے بہت بلند ہے۔

امام عالی مقام نے اپنے بڑے فرزند امام حسنؑ کو وصیت فرمائی تھی: اے حسنؑ اپنے ظاہر و باطن میں اللہ سے ڈرتے رہنا اور جو کچھ کرنا اسی کی خوشنودی کے لیے کرنا۔ غریبوں، مسکینوں اور مصیبت کے ماروں سے ہمیشہ محبت اور ہمدردی کا برتاؤ رکھنا اور کبھی لوگوں کی بھلائی اور اصلاح و فلاح کے کاموں میں کوتاہی نہ کرنا۔

امیر المومنین حضرت علیؑ کی زندگی اسلامی فکر و کردار کی بلند ترین مثال ہے جو زمانہ کے ہر موڑ پر انسانیت کی رہنمائی کرتی رہے گی۔

کلام امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام

اَلنَّاسُ مِنْ جِهَةِ التِّمْثَالِ اَكْفَآءُ
اَبُوْهُمْ اٰدَمُ وَالْاُمُّ حَوَّآءُ

ان اشعار میں آپ نے بیان فرمایا ہے کہ انسان کا شرف کیا ہے؟

لوگ شکل وصورت میں سب کے سب برابر ہیں سارے انسانوں کے باپ حضرت آدم علیہ السلام ہیں اور ان کی ماں حضرت حوّا ہیں۔ امیر المومنین حضرت علیؑ ارشاد فرماتے ہیں کہ جتنے بھی دنیا میں انسان ہیں وہ ظاہری صورت اور خلقت کے اعتبار سے آپس میں ایک ہی جیسی حیثیت رکھتے ہیں۔ جس طرح ایک ہاتھ پیر رکھتا ہے دوسرا بھی رکھتا ہے جس طرح ایک انسان کے اعضاء ہوتے ہیں دوسرے کے بھی ہوتے ہیں۔ پیدائش کے بعد جس طرح عمر کے بڑھنے کے ساتھ جسمانی تبدیلیاں ایک انسان میں پیدا ہوا کرتی ہیں دوسروں میں بھی ہوتی ہیں اور سب کی بناوٹ یکساں ہے اور ایک ہی ماں باپ کی سب اولاد ہیں خواہ وہ کسی بھی خطۂ زمین کے رہنے والے ہوں، کسی ملک کے باشندے ہوں۔ کسی قوم اور قبیلہ سے تعلق رکھتے ہوں اور کسی خاندان کے افراد

کیوں نہ ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جسمانی ساخت اور بناوٹ یا مادی شکل وصورت اور اولادِ حضرت آدمؑ و حواؑ ہونے کا جہاں تک تعلق ہے تمام انسان آپس میں برابر ہیں اور سب ہی اللہ کی مخلوق ہیں اب اگر ایک انسان دوسرے سے شرف اور فضیلت میں بڑھ سکتا ہے تو صرف اپنے عمل اور کردار کی وجہ سے اور اپنے علم و معرفت اور بلندیٔ اخلاق کے سبب سے جیسا کسی انسان کا علم و عمل ہوگا اسی کے مطابق اس کی قیمت وعزت ہوگی (الحجرات/۱۳) اس سلسلہ میں قرآن کریم کا ارشاد ہے:

یَا اَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَ جَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَائِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ۔" اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت (یعنی حضرت آدمؑ و حواؑ) سے پیدا کیا ہے اور ہم نے تمہارے قبیلے اور برادریاں بنا دیں تاکہ تم میں سے ایک دوسرے کو پہچان لے اس میں شک نہیں کہ خدا کے نزدیک تم سب میں بڑا عزت والا وہی ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہو۔ فتح مکّہ کے موقع پر حضرت سرور انبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم نے اپنے ایک مشہور خطبہ میں اسی مفہوم کو ان الفاظ میں ارشاد کیا تھا: اَیُّهَا النَّاسُ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ اَذْهَبَ عَنْکُمْ بِالْاِسْلَامِ نَخْوَةَ الْجَاهِلِیَّةِ وَ تَفَاخُرَهَا بِآبَائِهَا اَلَا اِنَّکُمْ مِنْ آدَمَ وَ آدَمُ مِنْ تُرَابٍ وَ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰکُمْ۔" خدا نے اسلام کے ذریعہ جاہلیت کے

زمانہ کے فخر و غرور اور باپ داداؤں پر اکڑنے اور تکبّر کرنے کو مٹا دیا،
تمہیں یہ بات بھولنا نہ چاہیئے کہ تم سب کے سب حضرت آدمؑ کی اولاد ہو
اور وہ مٹی سے بنے تھے اور جس کے دل میں خدا کا خوف سب سے زیادہ ہوگا
وہی اسکے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ انسان
کی اصلی شرافت صرف اسکے اچھے عمل اور کردار ہی کی وجہ سے ہے
اب رہا نسل ونسب کا فرق یا کوئی دوسرا دنیاوی امتیاز تو وہ بلندی
کردار کے ساتھ سونے پر سہاگہ ہو جائے گا لیکن اگر ایمان ہی موجود نہیں
ہے اور کردار ہی خراب ہے تو پھر صرف نسل و نسب یا اور کوئی امتیاز
فائدہ نہ دے گا اور اس کی کوئی بھی قیمت نہ ہوگی۔

لَا فَضْلَ اِلَّا لِاَهْلِ الْعِلْمِ اِنَّهُمْ
عَلَى الْهُدىٰ لِمَنِ اسْتَهْدىٰ اَدِلَّاءُ

صرف صاحبانِ علم ہی کو بزرگی حاصل ہے۔ یقیناً وہ ہدایت
پر ہیں اور ہر طالب ہدایت کے لیئے رہبر و رہنما ہیں۔ اس شعر میں
حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السّلام نے علم کی فضیلت
کو بیان فرمایا ہے اور صاف الفاظ میں یہ بتایا ہے کہ فضیلت و شرف
صرف ان ہی لوگوں کا حصہ ہے جو علم رکھتے ہیں۔ جاہل کسی فضیلت اور
عزّت کا استحقاق نہیں رکھتا۔ علم نہ رکھنے والے خود بھی ہدایت پر ہوتے

ہیں اور اپنے اس علم کی وجہ سے دوسرے انسانوں کی ہدایت کا سبب بھی بنتے ہیں۔ اس کلام امامِ عالی مقام میں "علم" سے مراد صرف وہ علم ہے جو انسان کو اسکے اصل فرض سے آگاہ کر دے جو اللہ نے اس کے لیئے مقرر فرمایا ہے، وہ علم جو حق و باطل میں فرق ظاہر کر دے اور مجاز کے پردے ہٹا کر حقیقت کے نور کی روشنی کو سامنے لے آئے وہ علم جو انسان کے نفس میں پاکیزگی پیدا کرے اور اس کے اخلاق و کردار میں بلندی پیدا کر دے، جو دیانت و حق پرستی کی تعلیم دے جو انسانی زندگی کے اصلی مقصد سے آگاہ کرے، وہ علم جو جہالت و گمراہی کے اندھیرے سے نکال کر ہدایت کے روشن راستے دکھا دے اور حیوانیت کی سطح سے اونچا کر کے انسان کو حقیقی انسان بنا دے لیکن وہ علم کسی طرح بھی انسان کے لیئے باعثِ شرف نہیں ہو سکتا جو اسکی عزت کو کم کر دے اور قدر و منزلت کو گرا دے جو بجائے ہدایت کرنے کے اسے اور زیادہ گمراہی میں مبتلا کر دے، اس کے اخلاق کو پست کرے اور خود اس انسان کو اور اس کی وجہ سے دوسرے انسانی افراد کو فائدہ پہنچانے کے بجائے ان کے نقصان اور ان کی تباہی و بربادی کا سبب بن جائے۔ جس طرح تلوار ایک ہتھیار ہے جو اپنے بچاؤ کے لیئے بھی استعمال کی جاتی ہے اور مظلوموں کی حمایت میں

بھی چلائی جاتی ہے مگر کبھی خود مظلوموں کے گلے بھی اس سے کاٹے جاتے ہیں تو ہر چیز کی برائی اور اچھائی کا تعلق اس مقصد اور اس نتیجہ سے ہوتا ہے جو اس سے ظہور میں آیا کرتا ہے بس اسی طرح وہ علم جس سے انسانیت کی تعمیر ہوتی ہو اور جو بندہ کو اپنے معبود سے قریب کر دے وہ اس کیلئے شرف ہے اور جو علم انسانیت کی تخریب کرتا ہو اور اسے اسکے منصب و مقام سے گرا دے، خدا سے دور کر دے اور انسان کے مقصد خلقت اور غرض پیدائش کو بھلا دے وہ کسی طرح اس کے لیئے باعث عزت نہیں ہو سکتا بلکہ ایسا علم ننگِ انسانیت ہے اور اس تباہ کن علم سے جہالت بدرجہا بہتر ہے۔

قرآن کریم نے علم کی فضیلت کو اس طرح بیان فرمایا ہے:
قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ "کیا علم رکھنے والے اور جاہل برابر ہیں؟ یعنی ہرگز نہیں بلکہ علم والے بڑی فضیلت رکھتے ہیں۔ (الزمر/۳۹/۹)

خود حضرت سرورِ دو عالم کا ارشاد ہے: اَلْعِلْمُ حَيَاةُ الْاِسْلَامِ وَ عِمَادُ الدِّيْنِ "علم اسلام کی زندگی ہے اور علم ہی دینِ خدا کا ستون ہے

اسطرح اس شعر میں حضرت امیر المؤمنین نے اس حقیقت کا اظہار فرمایا ہے کہ اسلام علم و عقل کا دین ہے اور وہی علم انسان کے لیئے شرف

عزت کا سبب ہو سکتا ہے جو خود اس کیلئے اور سارے انسانی معاشرے کیلئے فائدہ مند ہو اور تعمیری ہو اور جسکے ذریعہ انسان گمراہی اور تباہی و بربادی سے نجات حاصل کر کے ترقی و خوشحالی حاصل کر سکے۔

کلامِ امیر المومنین حضرت علیؑ سے اقتباس

ان اشعار میں حضرت امیر المومنین علیؑ ابن ابی طالب علیہ السّلام نے اپنے فرزند امام حسنؑ سے خطاب فرمایا ہے لیکن حقیقت میں یہ تمام عالم انسانیت سے خطاب ہے آپ فرماتے ہیں:

تَرَدَّ رِدَآءَ الصَّبْرِ عِنْدَ النَّوَائِبِ
تَنَلْ مِنْ جَمِیْلِ الصَّبْرِ حُسْنَ الْعَوَاقِبِ

تم مصیبتوں اور پریشانیوں کے وقت صبر کی چادر اوڑھ لیا کرو تو اس صبر جمیل کے ذریعہ تم اچھے نتیجہ تک پہنچ جاؤ گے۔ اس شعر میں آپ نے کس حُسن اور خوبصورتی کے ساتھ اور کیسے فصیح و بلیغ انداز میں صبر کی فضیلت اور اسکی بلندی کو بیان فرمایا ہے۔ پہلے مصرع میں صبر کو چادر سے تشبیہ دی ہے۔ ظاہر ہے کہ چادر اوڑھنا اسی وقت بولا جاتا ہے جب اس سے پورے بدن کو چھپا لینا مراد ہو اس طرح آپ ارشاد کرتے ہیں کہ مصیبت کے وقت تمہارے کسی عمل اور جسم کے کسی عضو سے بھی کوئی

ایسی بات ظاہر نہ ہونے پائے جو صبر کے خلاف ہو پھر دوسرے مصرع میں فرماتے ہیں کہ اگر تم اسطرح صبر کروگے جسے "صبر جمیل" کہتے ہیں تو اپنے تمام مقاصد میں اس کے بہترین انجام تک پہنچ جاؤگے۔ ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ صبر کئی طرح کا ہوا کرتا ہے کبھی تو صبر بری اور قابل نفرت باتوں میں بھی ہوتا ہے اور کسی وقت مجبوری سے بھی صبر کیا جاتا ہے لیکن جو صبر قابل تعریف ہے اور جس کا امام عالی مقام نے اس شعر میں ذکر فرمایا ہے وہ ہے جو ارادہ اور اختیار سے کیا جائے اور عقل و شرع کے مطابق ہو اور جسکی غرض خدا کی خوشنودی حاصل کرنا ہو۔ اس صبر کا بڑا مرتبہ ہے۔ ایک حدیث میں ارشاد ہوا ہے: اَلصَّبْرُ مِنَ الْاِیْمَانِ کَالرَّاْسِ مِنَ الْجَسَدِ"۔ صبر جمیل کو ایمان سے وہی نسبت ہے جو سر کو پورے بدن سے ہوا کرتی ہے۔ دوسری حدیث میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَا صَبْرَ لَہٗ"۔ اس شخص کا ایمان سچا ایمان ہی نہیں ہے جو مصیبتوں پر صبر نہ کرے۔ قرآن کریم میں خدا نے فرمایا ہے: صبر کرنے والوں کو ان کے اس عمل کا بھرپور اور بے حساب بدلہ اور ثواب دیا جائے گا۔ یہ بات بھی ہمیں معلوم ہونا چاہیئے کہ صبر کرنے میں جس بے قراری کے اظہار کو منع کیا گیا ہے اس سے مراد وہ بیقراری ہے جو مخلوقات کے سامنے ظاہر کی جائے لیکن خدا کی بارگاہ میں بیقراری کا ظاہر کرنا اور اس سے مدد طلب کرنا تو ہر حال میں ضروری اور قابل تعریف ہے اسکے علاوہ وہ صبر بھی ممدوح نہیں ہو سکتا جسمیں صبر کرنے والا

ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے اور مایوسی میں مبتلا ہو کر مصیبتوں کے آگے گھٹنے ٹیک دے اور انکو دفع کرنے کی کوئی کوشش نہ کرے بلکہ وہی صبر قابل تعریف ہے جس میں مصائب کا بھرپور مقابلہ کیا جائے اور ساتھ ہی قدم میں لغزش پیدا نہ ہو اور انسان کے کسی قول یا عمل سے گھبراہٹ اور اضطراب ظاہر نہ ہونے پائے بلاشبہ ایسا صبر مصیبتوں کو نعمتوں اور کامیابیوں میں تبدیل کر دیتا ہے۔

وَکُنْ صَاحِباً لِلْحِلْمِ فِیْ کُلِّ مَشْہَدٍ
فَمَا الْحِلْمُ اِلَّا خَیْرُ خِدْنٍ وَصَاحِبٍ

تحمل اور بردباری کو ہر موقع پر اختیار کرو اس لئے کہ بردباری ہی بہترین دوست اور ساتھی ہے۔ یہ مسلّم ہے کہ نثر کے مقابلہ میں شعر کے اندر تاثیری پہلو زیادہ تیز ہوا کرتا ہے پھر اگر وہ شعر خود حسین و جمیل ہو تو اس کی تاثیر کی کوئی انتہا نہیں رہتی اس شعر میں بردباری کو اچھے ساتھی اور دوست سے تشبیہ دینے میں جو لطف پیدا ہوا ہے وہ اہل نظر سے پوشیدہ نہیں ہے "حلم" اس کو کہتے ہیں کہ غصہ کے وقت آدمی اپنے نفس اور اپنے ہوش و حواس کو قابو میں رکھے اور غیظ و غضب کی حالت کو اعتدال سے ہٹنے نہ دے۔ انسان کے ساتھی اچھے اور برے دونوں طرح کے ہوا کرتے ہیں مگر آپ فرماتے ہیں کہ "حلم" تمہارے لیئے اچھا دوست اور اچھا ساتھی ہے جس کی دوستی سے تم کو کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

پھر فرماتے ہیں:

وَمَا الْمَرْءُ اِلَّا حَیْثُ یَجْعَلُ نَفْسَہٗ
فَکُنْ طَالِبًا فِی النَّفْسِ اَعْلَی الْمَرَاتِبِ

یعنی انسان کو وہی رتبہ حاصل ہوگا جس کے لیئے وہ اپنے آپ کو پیش کرے گا۔ اس لیئے ہمیشہ تم اپنے لیئے بلند ترین مرتبہ کو طلب کیا کرو یہ ہمت کی بلندی اور عزم و جرارت پیدا کرنے کی بہترین تعلیم ہے۔ اس شعر میں حضرت امیرالمومنینؑ نے انسان کے مقصد حیات اور غرض خلقت کی تشریح فرمائی ہے اور اس نکتہ کو انوکھے طرز میں ظاہر کر دیا ہے کہ انسان کی ترقیاں غیر محدود ہیں اور یہ بات خود اس کے اختیار اور بس میں ہے کہ وہ ہر اس بلندی اور مرتبہ کو حاصل کرلے جو اس کے لیئے ممکن ہو۔

حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے بھی فرمایا ہے:
اِنَّمَا لِکُلِّ امْرِئٍ مَا نَوٰی۔ ہر انسان کے لیئے وہی مقام ہے جس کا اس نے دل سے عزم اور ارادہ کر لیا ہے اس شعر کے ذریعہ حضرت علی بن ابی طالب علیہ السّلام نے انسان کے دل میں عزم و ہمت اور دوسرے اعلیٰ مقاصد کی طلب کے بے پناہ جذبہ کو جگا دیا ہے اور بزدلی و مایوسی کو دور کرنے کی بڑی مؤثر کوشش فرمائی ہے۔

فَاِنْ تَکُنِ الدُّنْیَا تُعَدُّ نَفِیْسَۃً   فَدَارُ ثَوَابِ اللّٰہِ اَعْلٰی وَاَنْبَلُ

حضرت علیؓ بن ابی طالبؓ فرماتے ہیں۔ اگر دنیا کو بہت نفیس اور عمدہ شمار کیا جائے تو یقیناً اللہ کا دار ثواب یعنی اجر کا گھر اس سے کہیں اعلیٰ اور اشرف ہے۔

اس شعر میں دنیا سے مراد وہی دنیوی زندگی ہے جو صرف مادّی لذت اور عیش و آرام حاصل کرنے کے لیئے وقف ہو اور جس میں دینی قدروں کا کوئی تصور نہ ہو۔ اس دنیا میں جوانی کی رعنائیاں بھی ہیں اور عیش کی رنگینیاں بھی موجود ہیں مگر اس کی ہر چیز فانی ہے اور اس کی کسی لذّت میں دوام نہیں پایا جاتا۔ اس کے مقابلہ میں آخرت کی نعمتیں اور لذتیں ہمیشہ باقی رہنے والی ہیں۔ اُن کو کبھی فنا نہیں اور اُن کے سامنے دنیا کی لذت و راحت کسی شمار میں نہیں ہے اس لیئے عقل و ہوش کا تقاضہ یہی ہے کہ انسان دنیا کی ان فنا ہو جانے والی لذّتوں اور یہاں کے عیش و آرام میں مبتلا ہو کر آخرت کو نہ بھولے اور اپنی اس دنیا کو آخرت کی بلندی تک پہنچنے کا ذریعہ بنائے۔

وَاِنْ تَکُنِ الْاَرْزَاقُ قِسْماً مُقَدَّراً

فَقِلَّۃُ حِرْصِ الْمَرْءِ فِی الْکَسْبِ اَجْمَلُ

اگر روزیاں انسان کے لیئے اس کا معین اور مقرر حصہ ہیں جو ضرور ملیں گی تو روزی کی تلاش میں جس قدر حرص کم ہو وہ بہتر ہے۔

ان اشعار میں بظاہر ہر پہلے مصرع کو بطور ایک شرط کے فرمایا گیا ہے جس میں اس شرط کے پائے جانے اور نہ پائے جانے کے دونوں پہلو ممکن ہیں لیکن کبھی جب کوئی بات یقینی ہوتی ہے تو اس قسم کا شرطیہ جملہ کلام کو زیادہ پُرتاثیر اور حسین بنانے کے لیئے لایا جاتا ہے۔ اسکی مثالیں ہر زبان میں موجود ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تو رزق دینے کا وعدہ فرمایا ہے صرف تھوڑی کوشش شرط ہے اور وہ بھی اس طرح جس طرح اس نے حکم دیا ہے اور جب ایسا ہے تو سعی و کوشش کو اعتدال کے ساتھ ہونا چاہیئے اور بس اس حد تک ہونا چاہیئے جو اس کے لیئے ضروری ہو کیونکہ صرف ایسی ہی صورت میں عمل، جذبات اور عقل و ہوش میں توازن باقی رہ سکتا ہے اور بے اعتدالی اور حرص و ہوس کے مجنونانہ افعال اور ان کے خطروں سے بچا جا سکتا ہے۔

وَاِنْ تَکُنِ الْاَبْدَانُ لِلْمَوْتِ اُنْشِئَتْ
فَقَتْلُ امْرِءٍ بِالسَّیْفِ فِی اللّٰہِ اَفْضَلُ

اور اگر تمام جسم اور بدن مرنے کے لیئے پیدا کیئے گئے ہیں تو پھر آدمی کا خدا کی راہ میں تلوار سے قتل ہونا بہتر و افضل ہے۔ ظاہر ہے کہ موت سے کوئی انسان بچ نہیں سکتا اور جو پیدا ہوا ہے وہ ضرور موت سے ہمکنار ہو گا تو راہِ خدا میں جہاد کرنا اور شہید ہو جانا مومن کی بہترین

قسم ہے۔ موت اور زندگی دونوں ہی میں اپنے پست یا اعلیٰ مقاصد ہی کے سبب سے بلندی اور پستی پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے ایسی موت جو دین کی بقا اور خدمتِ حق کی راہ میں آئے وہ بلند ترین موت ہے اور موت نہیں بلکہ وہ تو ابدی حیات ہے کیونکہ ایسی موت سے انسانیت کے اعلیٰ مقاصد میں زندگی پیدا ہوتی ہے جیسا کہ خود قرآن کریم نے ہمیں بتایا ہے کہ راہ خدا میں شہید ہونے والے مرتے نہیں ہیں بلکہ وہ زندۂ جاوید ہوا کرتے ہیں۔ امام عالی مقام فرماتے ہیں۔

وَاِنْ تَکُنِ الْاَمْوَالُ لِلتَّرْکِ جَمْعُھَا
فَمَا حَالُ مَتْرُوْکٍ بِہِ الْمَرْءُ یَبْخَلُ

اور اگر مال و زر کا جمع کرنا اس لئے ہے کہ ہم اسے چھوڑ کر دنیا سے چلے جائیں تو ایسے ترکہ کی حالت کیا کہی جائے جس کے لیئے آدمی بخل کرتا ہے۔ حلال طریقوں سے مال کا حاصل کرنا اور اُسے احکامِ خدا کے مطابق خرچ کرنا قابل تعریف ہے اور اس کی پوری طرح اجازت حاصل ہے لیکن اگر مال و زر جمع کرنا صرف جمع کرنے کے لیئے ہو جبکہ حالت یہ ہے کہ کسی کے پاس بھی اس کا جمع کیا ہوا مال ہمیشہ باقی نہیں رہتا اور اگر زندگی میں

کچھ عرصہ کیلئے باقی رہ بھی گیا تو مرنے کے بعد اس کا ساتھ چھوڑنا یقینی ہے۔ ایسی بے وفا اور ناپائیدار چیز کو اپنا سمجھنا اور اس میں کنجوسی کرنا اور اسے اُن امور میں خرچ نہ کرنا جن میں اس کو خرچ کیا جانا ضروری ہے قطعی طور پر خلاف عقل اور بے اصل ہے۔ حضرت علیؑ نے اِن چار اشعار میں وعظ و نصیحت کو ادبی رنگ دے کر بیان فرمایا ہے اور علم اخلاق کے بنیادی نظریات کی اس طرح تشریح کردی ہے جو ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ اسلامی اخلاق کا کونسا بنیادی مسئلہ ایسا باقی رہ گیا ہے جو ان بلند اشعار میں نہ بیان کیا گیا ہو۔ اور یہ سب نظم میں تفسیر و تشریح ہے قرآنی آیات اور احادیثِ رسولؐ کی۔

آپ ایک دوسرے موقع پر ارشاد فرماتے ہیں۔ خلقت انسان کی عظمت کا بیان ہو رہا ہے۔ اس کی پستی کے اسباب کی طرف اشارے ہیں۔ اس کے اقتدار و اختیار کی وسعت کی تشریح ہے۔

دَوَاءُکَ فِیْکَ وَمَا تَشْعُرُ
وَدَاءُکَ مِنْکَ وَمَا تَبْصُرُ

اے انسان تیرے مرض کی دوا خود تجھ ہی میں موجود ہے مگر تجھے اس کا شعور نہیں اور تیرا مرض بھی خود تیری ہی وجہ سے ہے اور تو

دیکھتا نہیں یعنی روحانی اور جسمانی بیماری اور اس کا علاج سب کچھ خود انسان ہی کے پاس ہے مگر وہ اس سے بے خبر رہتا ہے۔ مرض خود اپنی غلطی، غفلت اور بے احتیاطی سے پیدا ہوتا ہے یا کم علمی اس کا سبب ہوتی ہے جو انسان کا خود اپنا ہی عمل ہے۔ اسی طرح دوا کا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ انسان کی طبیعت و مزاج میں اتنی قوت اور صلاحیت پیدا کر دے کہ بیماری کو دفع کر سکے یہی عمل دوا کے بغیر بھی ممکن ہے اگر جسمانی بے اعتدالیوں کو چھوڑ دیا جائے اور ان باتوں کا پورا خیال رکھا جائے جو صحتِ بدن و روح کے لیئے ضروری ہیں لیکن انسان اپنی اچھائی اور برائی نہیں سمجھتا اور اپنی روحانی اور جسمانی صحت و اعتدال کو کھو بیٹھتا ہے۔

بھرپور اعتماد و یقین کے ساتھ یہ بات وہی شخص کہہ سکتا ہے جو انسانی نفسیات اور فلسفۂ حیاتِ جسمانی سے پوری طرح باخبر ہو۔ اسی سلسلہ میں حضرت علیؑ فرماتے ہیں۔

وَتَحْسَبُ أَنَّكَ جِرْمٌ صَغِيرٌ

وَفِيكَ انْطَوَى الْعَالَمُ الْأَكْبَرُ

اور تم یہ خیال کرتے ہو کہ تم ایک چھوٹا سا جسم ہو حالانکہ تمہارے اس مختصر جسم میں عالم اکبر لپٹا ہوا ہے۔ خلقت انسان کی بلندی اور اس کی عظمت پر اس سے بہتر شعر ممکن ہی نہیں ہے گویا اس کا مطلب

یہ ہوا کہ جب ساری کائنات کو پھیلا دیا گیا تو وہ عالم اکبر بن گئی اور جب اسے سمیٹا گیا تو وہ انسان کی صورت میں ظاہر ہوئی اس طرح انسان کے جسم میں وہ سب کچھ موجود ہے جو کائناتِ عالم کی وسعتوں اور پہنائیوں میں پھیلا ہوا ہے۔

وَاَنْتَ اَلْکِتَابُ الْمُبِیْنُ الَّذِیْ
بِاَحْرُفِہٖ یَظْہَرُ الْمُضْمَرُ

اے انسان تو ہی وہ روشن کتاب ہے جس کے حرفوں سے کائناتِ عالم کے پوشیدہ راز ظاہر ہوتے ہیں۔

انسانی وجود کو روشن کتاب فرمانا اور اس کے اعمال اور علمی کاوشوں کو اس کتاب کے حروف سے تعبیر کرنا جن کی باہمی ترکیب اور تاثیر سے خلقت کے سربستہ رازوں کا ظہور ہوتا ہے۔ یہ ایک بالکل انوکھا طرز ادا ہے جس میں ادب شعری کے بلند ترین کمال کے ساتھ فلسفۂ حیاتِ انسانی کی ایسی تشریح ہے جس کی مثال ممکن ہی نہیں۔

فضیلتِ قرآنِ حکیم

دنیا میں اللہ نے انسان کی ہدایت کے لیئے پیغمبروں کو بھیجا تو انھیں معجزے بھی عطا فرمائے تاکہ ان کو دیکھ کر لوگ اُن پاک ہستیوں کی سچائی پر ایمان لائیں اور ان کی تصدیق کریں۔ گذشتہ پیغمبروں کے ساتھ ان کے معجزات بھی چلے گئے مگر قرآن حکیم حضرت سرور انبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ عظیم معجزہ ہے جو قیامت تک رہے گا۔ یہ وہ عظیم کلام اور عظیم معجزہ ہے جس کے لیئے سورۂ بنی اسرائیل میں اللہ کا ارشاد ہے: قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰۤى اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا۔ (بنی اسرائیل/۸۸)

اگر تمام انسان اور جن مل کر یہ چاہیں کہ اس قرآن کا مثل لے آئیں تو اس کا مثل نہیں لا سکتے اگرچہ اس کوشش میں ایک دوسرے کا مددگار بن جائے۔ اور سورۂ بقرہ میں اس طرح فرمایا گیا ہے: وَاِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ فَاِنْ

لَم تَفعَلُوا وَلَن تَفعَلُوا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي وَقُودُهَا النَّاسُ وَالحِجَارَةُ أُعِدَّت لِلكَافِرِينَ (البقرة/ ۲۴) اور اگر تم کو اس کلام میں جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے کچھ شک ہے تو پھر تم بھی ایسا ہی کوئی ایک سورہ بنا لاؤ اور خدا کے مقابلہ میں جو بھی تمہارے مددگار ہوں ان کو بھی بلا لو اگر تم سچے ہو پس اگر تم یہ نہیں کر سکتے ہو اور ہرگز نہیں کر سکو گے تو اُس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہوں گے جو کافروں کے لیئے تیار کی گئی ہے۔

جہاں تک قرآنِ پاک کے معجزہ ہونے کا سوال ہے چونکہ اس کا تعلق دنیا کی ہر قوم اور ہر انسان سے ہے خواہ اس کی کوئی بھی زبان ہو اس لیئے ظاہر ہے کہ اس کا معجزہ ہونا صرف اس کی ظاہری اور لفظی ساخت اور عربی فصاحت و بلاغت ہی میں منحصر و محدود نہیں ہو سکتا بلکہ بلاشبہ وہ اپنی معنوی عظمت کے لحاظ سے بھی اسی طرح معجزہ ہے جس طرح لفظی حیثیت سے معجزہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ قیامت تک آنے والی قومیں اور انسانی نسلیں خواہ وہ کوئی بھی زبان بولنے والی ہوں اپنی اپنی زبان میں کوئی ایسا کلام نہیں پیش کر سکتیں جو قرآنِ حکیم کی طرح لفظی فصاحت و بلاغت میں بھی معجزہ ہو اور معنوی وسعت و لطافت و بلندی میں بھی معجزہ ہو اور انسانی نسل

کی رہنمائی کے کام میں اس قدر مؤثر ہو سکتا ہو۔ اگرچہ قرآن حکیم کا مخاطب دنیا کا ہر انسان اور ہر قوم ہے مگر فطری اور اصولی طور پر اس مثل طلبی کی للکار کے ابتدائی اور سب سے پہلے مخاطب وہی لوگ تھے جن کی زبان عربی تھی کیونکہ قرآن خود عربی زبان میں ہے۔

اس وقت کے عربوں میں زبان دانی اور شعر و ادب کے ہر طرف چرچے تھے۔ انھیں اپنے اشعار اور اپنی نظموں کی فصاحت پر بڑا غرور تھا اور یہ بھی بڑی حد تک ایک حقیقت ہے کہ نظم میں جو اثر انگیزی اور جذب ہوتا ہے وہ نثر میں نہیں ہوتا اس بنا پر قرآن حکیم کا جلیل مقام اس بات سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اگرچہ نظم کی شکل میں نہیں ہے بلکہ عبارت اور نثر کی صورت میں ہے مگر پھر بھی اس میں اختصار، جامعیت، فصاحت و بلاغت، کلام و مفہوم اور لفظ و معنی کی وہ تمام خوبیاں اور بلندیاں موجود ہیں جن کے سامنے عرب ادیبوں اور شاعروں کی تمام نظمیں اور ادبی و شعری کاوشیں بے اثر اور بے حقیقت بن کر رہ گئیں اور آجتک نہ صرف عرب قومیں بلکہ دنیا کے کسی خطہ میں بھی بسنے والی قومیں قرآن کا مقابلہ نہ لاسکیں۔ اس کی تحدی اور للکار کو چودہ سو سال ہو رہے ہیں مگر دنیا کی متمدن ترین قوموں کے کتب خانے بھی اب تک اس کے مثل سے خالی ہیں۔

اور کسی میں بھی اس کا جواب پیش کرنے کی جرأت پیدا نہ ہو سکی۔

قرآن حکیم کی ایک ایک آیت میں اللہ نے علوم و معارف اور انسانی زندگی کے لیئے فلاح و نجات اور ترقی و خوشحالی کے ایسے اصول اور ضابطے جمع کر دیئے ہیں جنکی مثال ممکن نہیں ہے۔ اسی بنا پر قرآن حکیم کا پڑھنا، سننا، لکھنا اور سمجھنا ہر بات عبادت اور ایمان کی علامت ہے اور اسی وجہ سے تلاوت قرآن کو گناہوں کا کفّارہ فرمایا گیا ہے، جہنم کی آگ سے بچاؤ کہا گیا ہے۔ اور عذاب خداوندی اور ہر بلا سے حفاظت کا وسیلہ قرار دیا گیا ہے۔

ایک حدیث میں حضورؐ نے فرمایا ہے کہ جب کوئی مؤمن قرآن کی تلاوت کرتا ہے تو اس کے لیئے اللہ اپنی رحمت کے دروازے کھول دیتا ہے اور ہر حرف کے بدلہ میں ایک فرشتہ پیدا کرتا ہے جو تلاوتِ قرآن کرنے والے مؤمن کے لیئے اللہ کی تسبیح کرتا رہتا ہے۔ کبھی اس طرح ارشاد ہوا ہے کہ تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو قرآن کو خود بھی سیکھے اور دوسروں کو بھی سکھائے اور اس کی تعلیم دے۔ پھر جس طرح قواعد و ضوابط کے مطابق صحیح طریقہ پر تلاوتِ قرآن کا بے حد ثواب ہے، اسی طرح تلاوت کے سننے کا بھی بے انتہا ثواب ہے۔ اور فرمایا گیا ہے کہ قرآن حکیم کی فقط ایک

آیت ہی کی تلاوت یا اسے سننا خضوع وخشوع کے ساتھ بقصدِ عبادت تمام دنیا کی دولت سے بہتر ہے - اس لیئے اندازہ ہوسکتا ہے کہ پورے قرآن کی تلاوت کا کس قدر ثواب ہوگا اور ختم قرآن کرنے کا کیا اجر ہوگا -

اللہ تمام مسلمانوں کو توفیق عطا فرمائے کہ وہ اسکے کلام کو پڑھیں اور سمجھنے کی سعی کریں اور دوسروں کو بھی اس کی تعلیم دیں اور ان عظیم برکات کو حاصل کریں جنہیں اس میں اللہ نے ودیعت کیا ہے اس لیئے کہ ہماری دنیوی فلاح اور اخری نجات صرف اسی بات پر منحصر ہے کہ ہم قرآن حکیم کی تلاوت کریں، اس کے معانی و مطالب کو سمجھنے کی کوشش کریں اور اس کے ارشادات پر عمل کریں -

اللہ کی رسّی سے مراد قرآن کی روشنی میں

قرآن حکیم میں "حَبۡل" کا لفظ کئی مقامات پر آیا ہے لیکن "حَبۡلُ اللہ" کا جملہ صرف ایک ہی جگہ پر ہے یعنی سورۃ ال عمران کے دوسرے رکوع میں۔ پھر آگے چل کر اسی سورہ کے تیسرے رکوع میں "بِحَبۡلٍ مِّنَ اللہِ" کا جملہ فرمایا گیا ہے۔ باقی اور جگہوں پر "حبل" کی نسبت اللہ کی طرف نہیں دی گئی ہے۔ لغت عرب میں اس کے معنی رسّی، عہد و پیمان اور بدن کی رگ کے بھی آتے ہیں۔ جہاں لفظ "حَبۡل" کو براہ راست اللہ کی جانب نسبت دیکر بولا گیا ہے وہ سورۃ آل عمران کی یہ آیت ۱۰۳ ہے۔ "وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللہِ جَمِیۡعًا وَّلَا تَفَرَّقُوۡا" اور تم سب مل کر

اللہ کی رسی کو مضبوط تھامے رہو اور آپس میں انتشار نہ پیدا کرو اور پھر اسی سلسلہ میں یہ بھی فرمایا گیا ہے:

وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا"

اور اپنے اوپر تم اللہ کے اس احسان کو یاد کرو کہ جب تم لوگ آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اُسی نے تمہارے دلوں میں باہمی الفت پیدا کی اور تم اس کی مہربانی سے بھائی بھائی بن گئے۔

وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (آل عمران رکوع ۲) اور تم آگ کے گڑھے کے کنارہ تک پہنچ چکے تھے تو اللہ ہی نے تم کو اُس سے بچالیا اسی طرح اللہ تمہیں اپنی آیتیں کھول کر سناتا ہے تاکہ تم ہدایت پا جاؤ۔ اس جگہ مفسروں نے "حبل اللہ" کی تفسیر میں بہت سی حدیثیں بیان کی ہیں۔ بعض میں صرف قرآن حکیم کو حبل اللہ فرمایا گیا ہے، بعض میں قرآن و اہلبیت دونوں کو حبل اللہ کا مصداق قرار دیا گیا ہے۔ کتاب اللہ کیلئے

جب یہ لفظ بولا گیا ہے تو حدیث میں اس کے ساتھ ہی
یہ جملہ بھی آیا ہے "حَبْلُ اللّٰہِ الْمَمْدُوْدُ مِنَ السَّمَآءِ اِلَی الْاَرْضِ"
یہ اللہ کی وہ رسّی ہے جس کا ایک سرا آسمان میں ہے
اور دوسرا زمین کی طرف ہے اور کہیں اس طرح کہ
اس کا ایک سرا اللہ کے ہاتھ میں ہے اور دوسرا سرا
تمہارے ہاتھوں میں ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اگر تم اس کا
سہارا لوگے تو اللہ کا قرب حاصل کر سکو گے اور کبھی گمراہ
نہ ہوگے۔ بعض حدیثوں میں "حبلُ اللہ" سے مراد مسلمانوں
کا باہمی اتحاد و اتفاق لیا گیا ہے۔ کہیں کہا گیا ہے
کہ اس سے اطاعت خداوندی مقصود ہے اور کسی
جگہ اس سے مراد دین اسلام کو لیا گیا ہے لیکن بہرحال
ان تمام باتوں کا حاصل اور نتیجہ ایک ہی ہے اور مقصود
صرف یہ ہے کہ اُس قانون اور نظام زندگی پر عمل کیا جائے
جو اللہ نے اپنے بندوں کے لئے مقرر فرمایا ہے اور
جس کی تفصیل قرآن حکیم کے ذریعہ سے پوری طرح کی
جا چکی ہے۔ یہی وہ نظام زندگی ہے جس کی تعلیم سرورِ کائنات
صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے ہمیں دی ہے

اور یہی وہ قانون خداوندی ہے جس کا علم ہم کو عترتؑ اطہار اور صحابہؓ کرام کے وسیلے سے حاصل ہوا ہے۔ اس پیغام الٰہی اور قانون خداوندی پر عمل کرنا اور اس کے آگے سر تسلیم جھکا دینا ہی اسلام اور ایمان کی روح ہے جسے مجازی طور پر اللہ کی رسی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ ایک روحانی، اعتقادی اور عملی رابطہ ہے جو بندہ اور اللہ کے درمیان قائم ہوتا ہے اور اسی رشتہ اور رابطہ کو مضبوطی کے ساتھ تھامے رہنے اور قائم رکھنے کا ہمیں حکم دیا گیا ہے۔ ورنہ یہاں کوئی ایسی رسّی مراد نہیں ہے جسے ہم اپنی زبان میں اور عام بول چال میں رسّی کہا کرتے ہیں۔ بتانا صرف اسی قدر ہے کہ جس طرح رسّی کا تھام لینا گرنے والے انسان کے لئے نجات پانے کا ذریعہ بن جاتا ہے بس اسی طرح اسلام اور قرآن اور سرورؐ کائنات کے اسوۂ حسنہ کی پیروی خواہ وہ کسی وسیلے سے ہو، گمراہی سے نجات دلانے والی اور باعثِ فلاح ہے۔ اسی سورہ کے تیسرے رکوع میں بھی "حبل" کی نسبت اللہ کی طرف دی گئی ہے اور ارشاد ہوا ہے: ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوا إِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللَّهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَاءُوا بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۚ یعنی اہل کتاب جہاں بھی رہیں گے ذلت اُن سے چمٹی رہے گی سوائے

اُس کے کہ وہ اللہ اور مسلمانوں کی پناہ میں آجائیں اور وہ لوگ اللہ کے غضب میں گرفتار ہیں اور ناداری کی اُن پر مار پڑ چکی ہے۔ پھر آگے فرمایا گیا ہے کہ یہ سب کچھ اس وجہ سے ہے کہ انھوں نے اللہ کی نشانیوں کو جھٹلایا اور ان کا انکار کیا اور پیغمبروںؑ کا خون بہاتے رہے۔ اس مقام پر لفظ "حَبل" سے مراد "پناہ اور عہد و پیمان" ہے۔ اس کا بھی مطلب یہی ہے کہ جب تک اللہ کے ساتھ کئے ہوئے عہد و پیمان اطاعت کی پابندی نہ ہوگی اس وقت تک اللہ کے غضب اور دونوں جہان کی ذلت و رسوائی اور تباہی و بربادی سے چھٹکارا نہیں مل سکتا۔ امیر المومنین حضرت علیؓ نے ایک روایت میں فرمایا ہے کہ "حبل اللہ" سے مراد قرآن حکیم ہے۔ آپ نے فرمایا عنقریب طرح طرح کے فتنے اٹھیں گے تو لوگوں نے عرض کی پھر ایسے وقت میں نجات کا ذریعہ کیا ہوگا۔ قال کِتَابُ اللّٰہِ فِیۡہِ نَبَاءُ مَنۡ قَبۡلَکُمۡ وَخَبَرُ مَنۡ بَعۡدَکُمۡ وَحُکۡمُ مَا بَیۡنَکُمۡ وَھُوَ حَبۡلُ اللّٰہِ الۡمَتِیۡنُ۔" آپ نے فرمایا کہ ایسے وقت میں فسادات اور فتنوں سے نجات کا ذریعہ اللہ کی کتاب ہوگی اُس میں اُن لوگوں کے واقعات ہیں جو تم سے قبل گذر چکے ہیں اور ان کی خبریں بھی ہیں جو تمہارے بعد آئینگے۔

اور تمہارے ہر قسم کے معاملات سے متعلق احکام بھی موجود ہیں اور یہی اللہ کی مضبوط رسّی ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ "حبل اللہ" سے مراد ہر وہ ذریعہ اور وسیلہ ہے جس سے اللہ کی رضا حاصل ہو اور اس کی بارگاہ میں تقرب کی منزل مل سکے اور اسی بنا پر حدیثوں میں اس مفہوم کو مختلف انداز اور طریقوں سے بتایا گیا ہے لیکن اس میں سب سے بڑی شرط یہی ہے کہ ان وسیلوں اور ذریعوں کو جن کی "حبل اللہ" سے تعبیر کی گئی ہے پورے ایمان اور پکّے یقین کے ساتھ حاصل کیا جائے اور اس طرح ان کا دامن مضبوطی کے ساتھ تھام لیا جائے کہ پھر کوئی دنیوی طاقت اور کوئی لالچ یا کوئی خوف اور ڈر ہماری اس وابستگی میں جنبش نہ پیدا کر سکے۔ اور ہمیں راہِ حق سے نہ ہٹا سکے۔ پھر ظاہر ہے کہ "وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰہِ" کے حکم پر عمل کی وجہ سے جب ہمارا اصل رشتہ اللہ ہی سے ہوگا تو ہم اس کی ساری مخلوقات اور کائنات کی ہر چیز اور ہر ہستی کو بھی خود اپنی نگاہوں سے نہیں دیکھیں گے بلکہ اُن نگاہوں سے دیکھیں گے جو جلوۂ حق سے روشن ہوں گی۔ اور جو رضائے خداوندی کی تابع ہوں گی یعنی نہ تو ہماری یہ آنکھیں۔ ہماری آنکھیں رہیں گی اور

نہ ہمارے یہ دل ___ ہمارے دل رہیں گے۔ بیشک اللہ اپنی مخلوق سے محبت فرماتا ہے۔ حدیث میں ہے: اَلْخَلْقُ کُلُّھُمْ عِیَالُ اللّٰہِ وَاَحَبُّھُمْ اِلَی اللّٰہِ اَنْفَعُھُمْ لِعِیَالِہٖ "تمام مخلوقات (گویا) اللہ کا کنبہ ہے اور اس کے نزدیک اس کی کل مخلوقات میں سب سے زیادہ محبوب وہ ہے جو اللہ کے اس کنبہ کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچائے۔ ظاہر بات ہے کہ اللہ کا کوئی کنبہ نہیں ہے مگر حدیث میں اللہ کی مخلوق کو اس کا کنبہ اس وجہ سے کہا گیا ہے کہ وہ اس سے محبت فرماتا ہے اور جس طرح لوگ اپنے کنبے اور اپنی اولاد اور اپنے گھر والوں سے الفت رکھتے ہیں اس سے کہیں زیادہ اللہ اپنی مخلوق سے محبت فرماتا ہے تو پھر یہ بات کسی طرح بھی ممکن نہیں ہو سکتی کہ وہ مردِ مؤمن جو اپنا دیدہ دل رضائے الہٰی میں فنا کر دے اور وہی چاہے جو اللہ چاہتا ہے، اس کی مخلوق سے ذاتی دشمنی اور عداوت رکھے بلکہ جس طرح اللہ اپنی مخلوق سے محبت فرماتا ہے اسی طرح وہ بندہ بھی جو تابعِ مرضی الہٰی ہو گا اس کی مخلوق سے محبت کرے گا۔ اس سے صاف طور پر معلوم ہو گیا کہ دینِ اسلام اور قرآن حکیم دنیا کے لئے پیغامِ محبت و الفت لے کر آئے ہیں،

پیام عداوت و نفرت نہیں لائے ہیں۔ اسی طرح سچے مسلمان کی علامت حدیثوں میں یہ بتائی گئی ہے کہ وہ اپنی زبان اور ہاتھ سے کسی کو بھی تکلیف نہ پہنچائے اور اسی کی طرف ارشاد خداوندی سے بھی اشارہ کیا گیا ہے کہ "تم حبل اللہ یعنی اللہ کی رسّی کو مضبوط تھامے رہو اور آپس میں ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جاؤ" کیونکہ جو لوگ پورے خلوص اور پوری مضبوطی کے ساتھ حبل اللہ سے وابستگی رکھتے ہیں اُن کی صفوں میں ہمیشہ زبردست نظم و ضبط ہوا کرتا ہے، اُن میں افراتفری نہیں ہوتی، وہ پوری طرح منظم رہتے ہیں۔ منتشر نہیں رہتے، وہ آپس میں ایک دوسرے سے بے پناہ محبت رکھتے ہیں، عداوت اور بغض نہیں رکھتے پھر یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ انسانوں کی آپس کی عداوت کو اللہ ہی نے دور کیا اور انہیں ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا اور اُن کے اندر ایسی اخوت پیدا کر دی جو قریب ترین رشتہ داروں میں بھی نہیں ہوتی۔ بیشک ہماری نجات اور فلاح صرف اسی بات میں ہے کہ ہم "حبل اللہ" و مضبوط پکڑے رہیں یعنی دین اسلام پر مضبوطی سے قائم رہیں ور کتاب اللہ کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں اور آپس میں متفق متحد رہیں، صلح و امن کے راستہ پر گامزن رہیں، فتنہ و فساد کو ہوا نہ

دیں، اللہ کی مخلوق سے محبت کریں، انسانی معاشرہ میں، نفرت وعداوت
کے جراثیم نہ پھیلائیں۔ تاریخ ہمیں یہ سبق بار بار دے چکی ہے کہ
آپس کا نفاق اور انتشار رہی ہمیشہ قوموں کے لئے تباہ کن ثابت
ہوا ہے اور زندہ صرف وہی قومیں رہی ہیں اور رہتی ہیں جن
میں باہمی اتحاد واتفاق رہا ہو اور اسی یکجہتی اور اتحاد کی زبردست
طاقت کی وجہ سے کبھی کوئی اجنبی طاقت اُن کو تسخیر کرنے میں
کامیابی حاصل نہ کر سکی۔

اُخوّت اسلامی

اسلامی اُخوّت و برادری ہی مسلمانوں کی ترقی، خوشحالی اور استحکام کی سب سے بڑی اور سب سے زیادہ اہم بنیاد ہے۔ ہجرت سے قبل مکّہ میں بھی یہی اُخوّت و یگانگت مسلمانوں کا اپنے دشمنوں کے مقابلے میں سب سے زیادہ مؤثر ہتھیار تھا اور جب ہجرت کے بعد حضورؐ انور اور تمام مسلمان مدینہ میں آگئے تو یہاں بھی اسی اخوّت نے ان کی زندگی اور ترقی میں سب سے بڑا کردار ادا کیا۔

کون نہیں جانتا کہ بعثت سرورؐ کائنات سے پیشتر انسانی جان و مال کی کوئی بھی قیمت باقی نہ رہی تھی۔ ایک قبیلہ دوسرے قبیلے سے برسرِ پیکار تھا، ایک آدمی اپنے دوسرے انسانی بھائی کا گلا کاٹنے اور اُس کا خون بہانے کے لئے تیار رہتا تھا۔ خونریزی اور لوٹ مار کی وجہ سے عرب کا چپہ چپہ بدامنی کا مرکز بن گیا تھا۔ سرداری اور اقتدار

صرف اُسی کو میسّر تھا جس کے بازوؤں میں طاقت اور ہاتھ میں تلوار تھی۔ مظلوم اور بے بس لوگوں کی قسمت میں بربادی اور غلامی کے سوا کچھ نہ تھا۔

سرورِ کائنات صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے اِسلامی اُخوّت کا اعلان کر کے لوگوں کو بتایا کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے چاہے وہ غریب ہو یا امیر ہو، غلام ہو یا آقا ہو۔ حاکم ہو یا محکوم ہو۔ یہی وہ آلہی پیغام تھا جو حضورؐ انور کے ذریعہ سے انسانوں تک پہنچایا گیا تھا اور قرآن حکیم نے ان لفظوں میں بیان کیا تھا: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا (آل عمران ۱۰۳) اے اہلِ ایمان اللہ سے ڈرتے رہو جس طرح ڈرنے کا حق ہے اور تمہیں موت نہ آئے مگر ایسی ہی حالت میں کہ تم سچے مسلمان ہو اور دیکھو تم سب کے سب مل کر الٰہی رشتہ کو مضبوط تھامے رہو اور آپس میں ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جاؤ اور تم

اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد رکھو کہ تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے مگر یہ اللہ ہی ذات ہے جس نے تمہارے دلوں کو آپس میں جوڑ دیا پھر تو تم سب آپس میں بھائی بھائی بن گئے۔ اسی طرح سورۂ انفال ۴۶ میں اللہ کا ارشاد ہے : وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِیْحُکُمْ" مسلمانوں! تم آپس میں جھگڑے نہ کرو یعنی بھرپور اتحاد اور نظم وضبط کے ساتھ زندگی بسر کرو کیونکہ اگر تم میں اتحاد نہ رہا اور آپس میں جھگڑتے رہے تو ہمت ہار جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ اسی طرح سورۂ حجرات ۱۰ میں ہے : اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْکُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ" اہل ایمان تو آپس میں ایک دوسرے کے بھائی ہیں تو اپنے دو بھائیوں کے درمیان میل جول کرا دیا کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ اسی اخوّت و اتحاد نے ان بے سر و سامان، غریب و نادار اور بے یار و مددگار مسلمانوں کو جن کے پاس نہ تو دولت ہی تھی اور نہ سامانِ معیشت۔ نہ اُن کے پاس اپنے دشمنوں کا دفاع کرنے کیلئے سامانِ جنگ تھا اور نہ افرادی طاقت تھی، چند ہی دن میں دُنیا کی

عظیم ترین سلطنتوں اور منظم ترین لشکروں کے لئے ناقابلِ تسخیر بنادیا تھا۔ اسی اخوت نے مسلمانوں کے اندرونی تمام جھگڑے مٹا ڈالے اور بدترین دشمنوں کو بہترین دوستوں میں تبدیل کردیا اور اس دینی رشتہ اخوت کو خاندانی اور خونی رشتوں سے بہت زیادہ مستحکم بنادیا۔ نظر سے نظر ملی، قدم سے قدم ملے اور دل سے دل مل گئے۔ فارسی کی مثل ہے۔ دو دل یک شود بشکند کوہ را۔ دو دل اگر ایک ہو کر متحد ہو جائیں تو بڑے سے بڑے پہاڑ بھی اُن کے سامنے تھم نہیں سکتے۔

سرورِ کائنات نے جس اتحاد کی تعلیم دی تھی وہ صرف زبانی اتحاد نہ تھا، وہ عزم و ارادے کا اتحاد تھا۔ لباس اور رنگ زبان اور خطہ کا اتحاد نہ تھا بلکہ وہ دلوں اور روحوں کا اتحاد تھا۔ وہ اللہ کی بندگی اور دینی برادری کا اتحاد تھا جس کی بدولت مدینہ کے چند مسلمان بھوکے مزدوروں اور کسانوں کے قدموں کے سامنے چند ہی روز میں قیصر و کسریٰ کے تاج لوٹتے ہوئے نظر آنے لگے۔ اسی جذبۂ اتحاد نے حاکم و محکوم کا فرق مٹا دیا اور سب کو ایک ہی صف میں لاکر کھڑا کردیا۔ امراء اور رؤساء کے دلوں میں غریبوں کے دکھ درد کا احساس پیدا ہوا اور

ساتھ ہی غریبوں اور غلاموں کے دلوں میں امیروں اور آقاؤں کی محبت بھی ابھرنے لگی کیونکہ اسلام نے اس قسم کے تمام تفرقوں کو صرف اوپر ہی سے نہیں جڑ سے اکھاڑ دیا تھا۔ ہجرت کے بعد حضور انور نے مدینہ میں آتے ہی مسلمانوں کو جس بات کی سب سے پہلے تعلیم دی تھی وہ یہی آپس کا اتحاد و اتفاق تھا۔ آپ نے مہاجرین و انصار میں سے ہر ایک کو دوسرے کا بھائی بنادیا جس کے بعد مدینہ کے انصار کی یہ حالت ہوئی کہ انھوں نے مہاجرین یعنی اپنے ان دینی اور اسلامی بھائیوں کو اپنے ترکہ میں اور اپنی جائیدادوں میں بھی شریک بنا لیا اور اپنی کوئی بڑی سے بڑی قیمتی چیز بھی اپنے ان دینی بھائیوں سے عزیز نہ کی اور یہی حالت خود مہاجرین کی بھی تھی کہ وہ اپنے انصاری بھائیوں کے پسینے پر اپنا خون تک بہا دینے کے لئے تیار رہا کرتے تھے۔ کاش آج بھی ہم اپنے اس تابناک اور روشن ماضی کی ایک جھلک کا بھی تصور کر سکیں تو ہماری ساری مشکلیں ایک لمحہ میں ختم ہو جائیں۔

سرورِ کائنات نے ہمیشہ قرآن حکیم کے ارشادات اور خود اپنی مبارک حدیثوں اور سیرتِ طیبہ سے باہمی اتحاد و

یگانگت اور اتفاق و محبت کی تعلیم دی جس کی مثال دنیا کی
کسی دوسری قوم اور اس کے سربراہوں کی زندگی اور تعلیمات
میں نہیں ملتی۔ یہ بلاشبہ اسی اتفاق و باہمی محبت کا نتیجہ تھا
کہ مسلمان کی ابتدائی مدنی زندگی میں اُن کی تعداد کی زبردست
کمی، افلاس و تنگدستی، بے سروسامانی اور تمام دنیوی وسائل سے
محرومی کے باوجود اُن کے خود دار سروں اور طاعتِ خدا و
رسولؐ سے بھرے ہوئے دلوں کو باطل کی بڑی سے بڑی قوتیں
بھی اپنے سامنے نہ جھکا سکیں اور خون، موت اور تباہی و بربادی
کے ہولناک طوفان بھی اُن مردانِ حق کے قدموں میں غلامی
کی زنجیریں نہ ڈال سکے۔ اسلام دشمن طاقتیں پوری طرح
جانتی ہیں کہ مسلمانوں کا ناقابلِ تسخیر ہتھیار ہمیشہ اُن کا باہمی
اتفاق اور اُن کی اخوّت ہی رہی ہے اس لئے ان کی بھرپور
کوشش یہی ہوتی ہے کہ وہ اس اخوّت و برادری کے رشتوں
کو پارہ پارہ کر کے اُن میں افراتفری اور پھوٹ ڈال دیں۔
تو پھر مسلمانوں پر کسی بیرونی حملہ کی ضرورت ہی باقی نہ رہے
گی بلکہ خود ہی اپنی موت مر جائیں گے۔ ہمیں حالات کا گہری
نظر سے مطالعہ کرنا چاہیئے۔ ہمارے ماضی اور ہماری پچھلی

تاریخ نے ہمیں بہت کچھ بتا دیا ہے جس سے ہمیں اپنی الجھنیں اور مشکلات کو دور کرنے میں بہت بڑی مدد مل سکتی ہے اور ہم آسانی کے ساتھ سمجھ سکتے ہیں کہ کس چیز میں ہماری زندگی اور ترقی ہے اور کس بات میں تباہی و بربادی ہے لیکن اگر ہم نے اپنے شاندار ماضی کو فراموش کر دیا اور ذاتی وانفرادی مقاصد پر اخوّت اسلامی کے تقاضوں کو بھول گئے تو ہم پھر اس کے ہولناک اور تباہ کن نتائج کے لئے بھی پوری طرح تیار رہیں جنہیں ہم کسی حالت میں بھی روک نہ سکیں گے اس کے ساتھ ہی ہمیں یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ دو مسلمان آدمی جب آپس کے اختلافات دور کرنے کے لئے بیٹھتے ہیں اور دل سے اس کام کا بیڑا اٹھاتے ہیں کہ اب ہم سچی اخوّت کا ثبوت دیں گے تو پھر اُن کے سامنے نہ تو کوئی شرط و قید ہوا کرتی ہے اور نہ کوئی آئین و قانون ہوتا ہے جس کی پابندی کے بغیر باہمی اخوّت و برادری وجود میں نہ آسکے۔

اُن کے سامنے صرف ایک ہی قانون اور صرف ایک ہی چیز ہوتی ہے اور وہ ہے اخوّت اسلامی اور اس کے حدود محض وہی

ہوتے ہیں جنہیں کتاب اللہ اور سنّتِ رسولؐ نے بتادیا ہے۔ ان حدود کی پابندی کرتے ہوئے اخوت کا بھرپور اور بلا قید و شرط مظاہرہ اسلام کی اصلی روح اور مسلمان کی حقیقی زندگی ہے۔

سرور انبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث مبارکہ کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا حقیقی بھائی ہے۔ اصلی مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان کی عزت و آبرو اور جان و مال محفوظ رہے، ہر مسلمان کی عزت اور جان و مال یوم الحج اور کعبۂ مکرمہ کی طرح محترم ہے۔

اسلام کے بدترین دشمن مسلمانوں کو آپس میں لڑانا چاہتے ہیں۔ ہمیں اُن سے ہوشیار رہنا چاہیئے اور ان کے اس ذلیل مقصد کو کامیاب نہ ہونے دینا چاہیئے۔ ہماری پھوٹ اور نا اتفاقی اسلام دشمن طاقتوں کی گہری سازش کا نتیجہ ہے۔ آپس میں تبادلۂ خیال خواہ وہ کسی نوعیت کا ہو محبت و خلوص اور سچے برادرانہ جذبات کے ساتھ ہونا چاہیئے۔ اختلاف رائے مذہبی ہو یا سیاسی، اجتماعی ہو یا نجی اور ذاتی اس میں بہر صورت حدود الٰہیہ کی خلاف ورزی کرنا اور انہیں توڑنا

فرمانِ خداوندی کی توہین و تحقیر ہے جس کے جواز کا ایک سچے مسلمان کے لئے تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

اسلام دینِ محبت و اخوّت ہے وہ نا اتفاقی، پھوٹ اور عداوت و نفرت کی تعلیم نہیں دیتا۔

امید و ناامیدی

قرآن حکیم میں اللہ نے ناامیدی کو گمراہی اور کفر کی علامت قرار دیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ سچے ایماندار لوگ کسی حال میں بھی ناامیدی کا شکار نہیں ہوتے۔ حالات کیسے ہی ناخوشگوار ہوں اور ماحول کیسا ہی ناسازگار ہو مردِ مؤمن کے قدم کبھی ہرگز نہیں ڈگمگاتے! وہ کبھی پیچھے نہیں ہٹتے اور ان میں کبھی کمزوری نہیں پیدا ہوتی! نہ ٹوٹنے والی ہمت و جرأت، نہ شکست کھانے والا عزم اور نہ ختم ہونے والی امید ہمیشہ ان کی رہنمائی کرتی رہتی ہے۔ اس طرح اسلام کے نزدیک انسان کا سب سے بڑا انفرادی اور اجتماعی جرم "قُنوطیت" یعنی ناامیدی ہے جو اُسے دنیا اور آخرت کی فلاح و نجات اور ہر ترقی و بلندی اور کامیابی سے محروم کر دیتا ہے۔ قرآن حکیم میں طرح طرح سے اس اہم ترین حقیقت کی وضاحت فرمائی گئی ہے۔ سورۂ یوسف میں اللہ کا ارشاد ہے:- اِنَّہٗ لَا یَایۡئَسُ مِنۡ رَّوۡحِ اللّٰہِ اِلَّا الۡقَوۡمُ

الْکٰفِرُوْنَ" اللہ کی رحمت سے تو بس کافر لوگ ہی نا امید ہوا کرتے ہیں۔ سورۂ حجر ۵۶ میں ہے۔ "وَمَنْ یَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّہٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ" اپنے پروردگار کی رحمت سے بجز گمراہوں کے مایوس ہوتا ہی کون ہے"۔ اور اس سے پیشتر بھی یہ صاف حکم موجود ہے "فَلَا تَکُنْ مِّنَ الْقٰنِطِیْنَ" تم کبھی ہرگز ان لوگوں میں شامل نہ ہونا جو نا امید اور مایوس ہو جاتے ہیں۔ سورۂ زمر ۵۳ میں فرمایا گیا ہے "لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰہِ" اللہ کی رحمت سے نا امید نہ ہو۔ حدیثوں میں بھی مسلمانوں کو اس کی تعلیم دی گئی ہے کہ وہ ہمیشہ اپنی امیدوں کو قائم اور برقرار رکھیں اور کبھی نا امید نہ ہوں۔ ایک حدیث میں سرورِ کائنات صلعم نے فرمایا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ تعالیٰ یَقُوْلُ اَنَا عِنْدَ ظَنِّ عَبْدِیْ بِیْ وَاَنَا مَعَہٗ اِذَا دَعَانِیْ۔ (ترمذی) اللہ فرماتا ہے کہ میں اپنے بندے کی امید ہی کے پاس رہتا ہوں اور میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے"۔ امید اور نا امیدی یا بیم و رجا کے فلسفیانہ رخ پر قدیم فلاسفر میں ہمیشہ بحث ہوتی رہی ہے اور وہ یہ بات طے نہ کر سکے کہ انسان کو مجموعی طور پر پر امید ہی رہنا چاہیئے یا نا امید اور مایوس۔ آخر یہ تحقیق دو مختلف نظریاتی گروہوں میں تقسیم

ہو گئی۔

ایک وہ گروہ جسے دنیا کی ہر چیز میں مایوسی اور ناامیدی ہی نظر آتی ہے اور دوسرا وہ جس کو امید کے سوا کچھ بھی دکھائی نہیں دیتا۔ ایک غم کی تصویر ہے تو دوسرا خوشی کا مجسمہ ہے۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ یہ دونوں ہی راستے غلط ہیں اور صحیح وہی بات ہے جو اسلام نے بتائی ہے جس میں یہ دونوں رخ ایک ساتھ موجود ہیں۔ خوشی بھی ہے غم بھی ہے۔ اس نے انسان کو یہ بھی بتایا ہے کہ دنیا کی تمام بہاریں فانی اور زوال پذیر ہیں اور ساتھ ہی اس کے دل کو امید کا سہارا بھی دیا اور مایوسی کے مہلک مرض سے بچانے کی کوشش بھی کی یہ صرف اس لئے کہ اگر امید ہی امید ہو گی اور ناکامیابی کا کوئی خطرہ باقی نہ رہے گا تو انسان کی تمام عملی قوتیں معطل اور بیکار ہو کر رہ جائیں گی اور پھر یہی بے عملی اور سعی و کوشش کا تعطل یعنی بیکار ہو جانا اسے فنا اور بربادی کے گھاٹ اتار دے گا اور اگر صرف مایوسی و ناامیدی ہی ہو گی جب بھی اس کی عملی طاقتیں فنا ہونے سے بچ نہ سکیں گی۔ دنیوی زندگی کی ناکامیوں کا خوف اسے سعی پیہم اور عمل مسلسل کی طرف ابھارتا رہتا ہے۔

اس لئے کہ اسلام اسے اس خوف کے باوجود کسی وقت بھی مایوس نہیں ہونے دیتا۔ حضرت امام جعفر صادقؑ سے کسی نے دریافت کیا تھا کہ ایسے لوگوں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے جو زندگی بھر گناہ کرتے رہتے ہیں اور ہمیشہ یہی کہتے ہیں کہ ہم اللہ کی رحمت و مغفرت سے مایوس نہیں ہیں۔ ہمیں امید ہے کہ وہ ہمارے سارے گناہ بخش دے گا یعنی وہ توبہ نہیں کرتے بلکہ اسی امید بخشش پر ساری زندگی گناہ کرتے ہیں یہاں تک کہ انہیں موت آجاتی ہے تو آپ نے فرمایا" هٰؤُلَاءِ قَوْمٌ يَتَرَجَّحُوْنَ فِي الْاَمَانِيِّ كَذَبُوْا لَيْسُوْا بِرَاجِيْنَ اِنَّ مَنْ رَجَا شَيْئًا طَلَبَهٗ وَمَنْ خَافَ مِنْ شَيْئٍ هَرَبَ مِنْهُ" یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی جھوٹی آرزوؤں، موہوم امیدوں اور ولولوں میں جھولتے رہتے ہیں اور صحیح معنی میں ان کے دل حقیقی آرزو اور حقیقی امید و رجاء سے خالی ہوتے ہیں۔ کیونکہ جو شخص کسی مقصد کی سچی آرزو اور حقیقی خواہش رکھتا ہے وہ یقیناً اس کی طلب میں بھرپور سعی و کوشش بھی کرتا ہے اور جس کے دل میں کسی چیز کا خوف ہوتا ہے وہ اس سے بھاگنے اور بچنے کی پوری کوشش بھی کرتا ہے۔ اس حدیث کے مفہوم کی بناء پر اگر اسلام

نے ہمیں نا امیدی، مایوسی اور قنوطیت سے منع کیا ہے اور
اسے کفر و گمراہی کی علامت قرار دیا ہے تو اس کا مطلب یہی ہے کہ
ہم کو کسی صورت میں بھی خواہ حالات کتنے ہی پر خطر اور کیسے ہی
ناسازگار ہوں نا امید اور مایوس ہو کر اپنی عملی قوت و صلاحیت
کو معطل اور بیکار نہیں بنانا چاہیئے بلکہ ہر خطرہ کا پورے عزم و تدبر
اور بھرپور بہادری اور جرأت، محکم یقین اور کامل استقامت کے ساتھ
مقابلہ کرنا چاہیئے اور کسی حال میں بھی اپنے آپ کو زمانہ کی ہولناکیوں اور
زندگی کی ناکامیوں اور خطروں کے سامنے مایوس، نا امید اور بے لبس
نہیں بنانا چاہیئے۔ اللہ نے اہل ایمان کی نصرت کا وعدہ فرمایا ہے
مگر اس شرط کے ساتھ کہ اگر اہل ایمان خود اللہ کی نصرت کریں
گے تو وہ بھی ان کی نصرت فرمائے گا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ اگر
وہ اللہ کے حکم پر چلیں گے اور اس کی عطا کی ہوئی نعمتوں اور
طاقتوں کا صحیح استعمال کریں گے تو وہ کبھی نامراد اور ناکامیاب نہ
ہوں گے اس نے پہلے ہی اپنی کتاب پاک میں اس کا صاف صاف
اعلان فرما دیا ہے کہ "ہم نے تمہارے لئے سورج، چاند، ستارے
دریا، سمندر، پہاڑ، کشتیاں، جہاز، برق و باد، جانور، درخت
شب کی تاریکی اور دن کی روشنی غرض زمین و آسمان کی ہر چیز کو

مسخر کر دیا ہے اور تمہیں پوری کائنات پر حکومت کرنے کی صلاحیت اور اس پر سرداری اور فوقیت عطا کی ہے"۔ تو پھر اب یہ ہم اہل ایمان کا فرض ہے کہ ہم اس کی دی ہوئی نعمتوں کی تلاش کریں، کائنات کے ذرہ ذرہ پر جو بیر دے پڑے ہوئے ہیں وہ ہماری سعی پیہم کے قافلہ کا انتظار کر رہے ہیں۔ ہم نہ تھکنے والے قدم آگے بڑھائیں اور نہ مٹنے والی جرأت وعزم وہمت سے کام لیں تو اللہ کی نصرت وحمایت ہمارے سروں پر سایہ فگن ہوگی اور کامیابیاں خود آگے بڑھ کے ہمارے قدم چومنے لگیں گی۔

زمانہ کی گردشوں اور لیل ونہار کے حادثوں کو تسخیر کرنا اور انہیں اپنے عزم اور اپنی خود اعتمادی کے قدموں سے کچل کر آگے بڑھ جانا مرد مومن ہی کی قسمت کا نوشتہ ہے اور اللہ نے اپنے مومن بندوں ہی کو وہ بلند مقام اور عظیم اور مثالی اقتدار عطا کیا ہے جس کے سامنے خوف و ناامیدی ومایوسی محض کچھ بے معنی سے اور بے حقیقت سے لفظ بن کر رہ جاتے ہیں۔ سچا اور خدا شناس انسان قنوطیت اور مایوسی اور خوف ودہر اس کے لئے نہیں پیدا ہوا وہ خطروں کے سامنے کبھی نہیں گڑگڑاتا، اس کی کتاب زندگی میں "ڈرنے اور مایوس وناامید ہوجانے" کے لفظوں کا وجود ہی

نہیں ہوتا بلکہ خطروں کی گھنٹیاں اور ان کے دہشت خیز دھمکے اسے بے بس اور مایوس بنانے کے بجائے اُس کے ناقابل تسخیر عزم و ہمت کے لئے ترقی اور طاقت کے نئے نئے راستے کھول دیتے ہیں۔ ۱۵ شوال ۳ھ ہفتہ کے روز مدینہ میں مسلمانوں کو جنگ اُحد میں جو زبردست شکست اٹھانا پڑی تھی اگر کوئی دوسری قوم ہوتی تو پھر سانس بھی نہ لے سکتی اور مایوسی کے گہرے غار میں ہمیشہ کے لئے دفن ہو جاتی لیکن چونکہ مسلمان کی پیدائش احساسِ شکست کے لئے نہیں ہوتی ہے اس لئے وقتی شکستیں اور عارضی ناکامیاں اسے کسی حالت میں بھی ذہنی طور پر شکست خوردہ نہیں بنا سکتیں۔ غرض دوسرے ہی روز جب ابو سفیان کی فاتح قوم نے مدینہ پر حملہ کا ارادہ کیا تو رسول اللہ کی ایک ہی آواز پر وہ مسلمان سپاہی جو میدانِ اُحد میں زخموں سے نڈھال ہو چکے تھے، غضبناک شیروں کی طرح مقام حمراء الاسد کی طرف چل کھڑے ہوئے اور جب دشمن نے مسلمانوں کے اس ناقابل تسخیر عزم کو دیکھ لیا تو پھر اُس کی یہ جرأت نہ ہو سکی کہ وہ مدینۂ طیبہ کی طرف رخ بھی کر سکے۔

-ہمیں-

مردِ مؤمن کی نصرت خدائے ذوالجلال کا وعدہ ہے!
اللہ کے شیروں کا عزم ناقابلِ تسخیر ہوتا ہے! وہ کبھی مایوس
اور ناامید نہیں ہوا کرتے!

صدق و اخلاص

'صدق' سچائی کو کہتے ہیں اور 'اخلاص' سے مراد ایسی محبت اور رابطہ یا لگاؤ اور فرماں برداری ہوتی ہے جس میں ذرا سی بھی کھوٹ، دکھاوا اور منافقت نہ ہو'۔

قرآن حکیم نے ہمیں صدق و اخلاص کی تعلیم دی ہے اور کذب و نفاق سے روکا ہے اور یہ بتایا ہے کہ اللہ کے نزدیک حقیقی مسلمان صرف وہ ہے جو اپنی سیرت میں سچائی اور اخلاص رکھتا ہو اور اس کے مقابلے میں جس کا صدق و اخلاص سے کوئی تعلق نہ ہو اس کا اسلام سے بھی کوئی رشتہ نہ ہوگا۔ درحقیقت اسلام کے لفظ کا مفہوم یہی ہے کہ انسان اپنی ذات اور اپنی تمام خواہشوں کو اللہ کی مرضی کے سپرد کر دے اور اس کے سامنے سر تسلیم جھکا دے۔ ظاہر ہے کہ اگر اس جذبۂ فرماں برداری میں کچھ بھی کھوٹ ہوگا یا کسی حیثیت سے بھی شرک اور نفاق پایا جائے گا تو اس کا اسلام سے کوئی بھی رشتہ باقی نہیں رہ سکتا۔ قرآن حکیم

نے جس انداز اور جس لب و لہجے کے ساتھ ہمیں صدق و
اخلاص کی تعلیم دی ہے اس پر تھوڑا سا بھی غور کرنے کے
بعد ہم آسانی کے ساتھ سمجھ سکتے ہیں کہ اسلام کا صدق و اخلاص
کے ساتھ کیسا رابطہ ہے اور آیا بغیر ان باتوں کے "اسلام" کا
کوئی بھی تصور ہو سکتا ہے یا نہیں۔ سورۂ حُجُرات (آیت ۱۵)
میں اللہ کے ارشاد کا ترجمہ یہ ہے: یقیناً سچے مومن تو وہی لوگ ہیں
جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائے اور پھر اس ایمان کے
بعد انھوں نے کبھی شک نہیں کیا اور اپنے اموال اور اپنی جانوں
سے اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ پس ایسے ہی لوگ سچے ہیں۔"

اسی طرح سورۂ زُمَر (آیت ۳۳) کا ترجمہ یہ ہے: جو
لوگ سچی بات لے کر آئے اور جنہوں نے سچی بات کی تصدیق
کی تو ایسے ہی لوگ صاحبانِ تقویٰ ہیں۔"

اور اس سے پہلے کی آیت میں یہ ہے: اس شخص سے
بڑھ کر ناانصافی کرنے والا کون ہو سکتا ہے جو اللہ پر جھوٹ
لگائے اور سچی بات کو جھٹلائے جبکہ وہ سچی بات اس کے پاس
پہنچے، کیا ایسے کافر دل کا ٹھکانا جہنم نہیں ہے یعنی یقیناً ایسے
لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہی ہے۔

اسی طرح سورۂ توبہ (آیت ۱۱۹) میں ہے: "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ" اے ایمان والو! اللہ سے ڈرتے رہو اور سچے لوگوں کے ساتھ رہا کرو۔

صدق ایک ایسی جامع صفت ہے جس میں نیکی اور اچھائی کا ہر پہلو موجود ہے جب کہ برائی کا اس سے کوئی بھی تعلق ممکن نہیں۔ قرآن حکیم نے "صادقین" کی جو صفتیں بیان کی ہیں انھیں غور سے دیکھئے تو اس لفظ کی وسعت کا پوری طرح اندازہ ہو سکے گا۔

سورۂ بقرہ (آیت ۱۷۷) ترجمہ: نیکی یہ نہیں ہے کہ تم اپنا رخ مشرق یا مغرب کی طرف کرلو بلکہ نیکی یہ ہے کہ کوئی شخص اللہ اور قیامت کے دن، فرشتوں، آسمانی کتابوں اور انبیاء پر ایمان رکھے اور اللہ کی محبت میں اپنا مال قرابت داروں، یتیموں مسکینوں، نادار مسافروں اور سوال کرنے والوں نیز گردنوں کو آزاد کرنے پر خرچ کرے اور نماز کو پابندی کے ساتھ پڑھے اور زکوٰۃ ادا کرے۔ ان صفتوں کے ساتھ ہی جن لوگوں میں یہ صفات بھی ہوں کہ وہ اپنے وعدوں کو وفا کرنے والے ہوں اور

سختی اور بیماری میں نیز جنگ کے وقت پوری استقامت اور صبر سے کام لیں" أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ" ایسے ہی لوگ سچے ہیں اور یہی لوگ متقی ہیں۔

اس آیت سے ہمیں اس کا پوری طرح علم ہو سکتا ہے کہ "صدق" کے معنی میں کس قدر پھیلاؤ ہے اور اس کے وسیع دائرے سے کوئی نیکی الگ نہیں ہو سکتی۔ غرض قرآنی اصطلاح میں "صدق" کا مطلب ہے کہ انسان کی پوری زندگی اور اس کی ساری شخصیت سچائی کے تقاضوں کے مطابق ہو اور اُن حقائق کی آئینہ دار ہو جو آفاقی ہوں اور ماحول یا زمان و مکان کی قیدوں کے پابند نہ ہوں۔

دوسری بات جو ہمیں معلوم ہوئی وہ یہ ہے کہ جبتک سچائی نہ ہو گی، تقویٰ اور پرہیزگاری کا وجود ممکن نہیں ہو سکتا اور جب تک یہ دونوں باتیں نہ ہوں، انسان کائنات کے معاشرے میں اس افضلیت اور سرداری کی منزل کو حاصل نہیں کر سکتا جس کے لئے اسے پیدا کیا گیا ہے۔

اسی مقام صدق کو دوسرے انداز میں "مقام عبدیت" کہتے ہیں اور جس طرح "صدق" کے مرتبے اور منزلیں ہیں "عبدیت"

کے بھی درجے ہیں بس فرق اتنا ہے کہ "صدق" ایک حقیقت ہے اور عبدیت و اخلاص اس کی تجلّی ہے یا دوسرے لفظوں میں "صدق" اصل و اساس ہے اور عبدیت و اخلاص اس کا آئینہ ہے اب یہ آئینہ جس قدر صاف اور شفاف ہوگا اسی قدر صدق کی حقیقت ابھرتی جائے گی۔ اس بات کو ہم یوں سمجھ سکتے ہیں کہ "صدق" یعنی سچائی ہر تاثیر و تسخیر کی دسترس سے باہر ایک غیر متغیّر و غیر متزلزل واقعیت اور حقیقت ہے اور جب انسانی نفس کا اس کے ساتھ ایسا رابطہ قائم ہو جس میں کوئی کھوٹ نہ ہو اور جو ہر شائبے سے پاک و صاف ہو تو یہی رابطہ اور تعلق اخلاص کہلاتا ہے۔ قرآن حکیم نے جابجا اخلاص کو اپنے مخصوص لب و لہجہ میں جس طرح ذکر کیا ہے اس کا اندازہ چند آیتوں کے ان ترجموں سے ہوتا ہے جن کا ابھی ذکر کیا جارہا ہے۔ سورۂ زُمَر کی دوسری آیت میں ہے۔ بیشک ہم نے (اے رسولؐ) تمہاری طرف اس کتاب کو حق کے ساتھ نازل کیا ہے۔ "فَاعْبُدِ اللّٰہَ مُخْلِصًا لَّہُ الدِّیْنَ" تو تم خالص اعتقاد کے ساتھ اللہ ہی کی عبادت کرتے رہو۔ سورۂ اعراف (آیت ۲۹) میں "وَادْعُوْہُ مُخْلِصِیْنَ لَہُ الدِّیْنَ" کا جملہ آتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی عبادت

پورے اخلاص سے کی جائے اور اس میں اللہ کے سوا کسی غیر کی شرکت نہ ہو اور نہ اس عبادت میں کسی ایسے مقصد کی آمیزش ہونے پائے جو روح عبادت الٰہی اور شانِ اخلاص کے منافی ہو۔

صدق اور اخلاص کا باہمی رابطہ اور رشتہ اگر پورے کمال کے ساتھ قائم ہو جائے تو انسانی فرد کے لئے بھٹک جانے اور گمراہ ہو جانے کا اندیشہ ہی باقی نہیں رہتا اسی لئے خود شیطان اس بات کا بار بار اعلان کرتا رہا ہے کہ میں سب کو بہکاؤں گا مگر اے اللہ جو تیرے مخلص بندے ہوں گے ان کو نہیں بہکا سکوں گا۔ چنانچہ سورۂ صٓ (آیت ۸۳) میں ہے: شیطان نے اللہ کی بارگاہ میں عرض کی کہ تیری عزت کی قسم میں سب ہی کو گمراہ کروں گا مگر تیرے اُن بندوں کو نہیں جو مخلص ہوں گے۔

صدق و اخلاص ہی وہ بنیادیں ہیں جن پر حُسنِ کردار کی عمارت بنتی ہے اور جس کے ذریعہ سے انسان کو قیادت اور سرداری کا حق ملتا ہے۔ اسی بنا پر قرآن حکیم نے اللہ کے اس فرمان کا اعلان کر دیا ہے جس کو ابھی بیان کیا جا چکا "یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَکُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ" اے اہل ایمان اللہ سے ڈرو اور سچوں کے ساتھ رہو یعنی ایسے لوگوں کی قیادت کو

دل سے تسلیم کرو جو صدق اور سچائی کی صفت سے آراستہ ہیں پھر یہ بات صاف ہے کہ اب جس قدر بھی کسی انسان میں یہ صفت بڑھتی جائے گی اس کی فوقیت و بزرگی و سرداری وسیع تر ہوتی جائے گی اور ساتھ ہی دوسروں پر اس کی قیادت کا دائرہ بھی پھیلتا جائے گا۔

صدق و اخلاص کی بلند ترین منزل "عصمت" کہلاتی ہے اور اسی بناء پر چونکہ اپنے اپنے زمانہ میں انبیاء و مرسلین علیہم السلام کو نوع انسان کی، بلاشرط و قید، قیادت کا منصب عطا کیا گیا تھا۔ اُن کا معصوم ہونا ضروری تھا کیونکہ الٰہی قانون میں غیر مشروط قیادت کا خطا کاری کے ساتھ جمع ہو جانا ممکن ہی نہیں ہے۔

خلاصہ یہ ہوا کہ "صدق" کے معنی صرف زبان کی سچائی کے نہیں ہیں بلکہ اس کے وسیع تر معنی میں ہر قسم کی سچائی شامل ہے اور اس سچائی کے دو رُخ ھیں ایک ان چیزوں اور اُن مسائل کی اصل حقیقت جن سے اعتقاد اور عمل کا تعلق ہو سکتا ہے اور دوسرے وہ حقیقی رابطہ جو انسانی عمل اور اعتقاد کا ان حقائق سے ہوا کرتا ہے۔ اسی کو ہم مختلف حیثیتوں میں اسلام، ایمان اور اخلاص کہتے ہیں۔

اور جس کے نتیجے میں ارادہ اور نیت و عزم کی سچائی اور اس ارادے کو پورا کرنے میں سچائی اور قول کی سچائی بلکہ زندگی کے ہر موڑ اور رخ پر سچائی کا ظہور ہونے لگتا ہے یعنی زبان، دل اور عمل یہ تینوں مقام صدق اور سچائی کا مظہر بن جاتے ہیں اور جب صدق و اخلاص کی اس منزل پر رہ نورد حقیقت و معرفت کے قدم آجاتے ہیں تو پھر اس کے عزم و ایمان میں عالم کی کوئی طاقت خلل نہیں ڈال سکتی۔

اس پوری گفتگو کا حاصل یہ ہوا کہ صدق و اخلاص ایمان کی سب سے بڑی بنیاد اور اہم ترین شرط ہے۔ بغیر اس بنیاد اور اس شرط کے کوئی بھی سچا مؤمن نہیں بن سکتا اور جب کوئی انسان اس منزل پر آجائے تو اللہ سے زیادہ پھر اس کے لیے کوئی محبوب باقی نہ رہے گا اور جب دل میں اللہ کی محبت پیدا ہو گی تو ساتھ ہی اس کی مخلوق کی محبت خود بخود آجائے گی کیونکہ جو شخص کسی کو دل سے چاہتا ہو اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ اپنے محبوب کے محبوب سے بھی محبت کرے۔ اللہ اپنی مخلوق سے محبت کرتا ہے اس لئے اس کے بندوں کے لئے بھی ضروری ہے کہ وہ اُس کی مخلوق سے محبت کریں اور جو کچھ

اس محبت کے تقاضے ہیں انہیں پورا کریں۔

اور اسی لئے جب ہم دیکھ رہے ہیں کہ انسانوں پر طرح طرح کی تباہیاں نازل ہو رہی ہیں۔ کہیں قتل و غارت کا بازار گرم ہے، کہیں زلزلوں نے قیامت برپا کر رکھی ہے اور کہیں سیلاب کے طوفانی حملوں سے انسانی اور حیوانی زندگی بربادیوں کا شکار ہو رہی ہے تو ہمارے ایمانی صدق و اخلاص کا تقاضا ہے کہ ہم جس طرح بھی ممکن ہو سکے۔ اپنے بھائیوں کے غم میں شریک ہوں اور ان کی مدد کریں۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ خود ہمارے ہی ملک میں سیلاب کی تباہ کاریوں سے آبادیاں ویرانوں میں تبدیل ہو چکی ہیں۔ ہزاروں گھر اُجڑ گئے ہیں، جو فصلیں برباد ہو گئیں، کروڑوں روپیہ کا سامان تباہ ہو چکا ہے جس کی وجہ سے ہمارے لاکھوں انسانی بھائی اپنے ہر سرمایہ سے محروم ہو گئے ہیں۔ یقیناً یہ ہمارے ایمان کا امتحان ہے اور ہمارے مسلمان ہونے کی آزمائش ہے۔ اللہ یہ دیکھنا چاہتا ہے کہ ہم میں اسلامی اور انسانی ہمدردی کا کس قدر جذبہ موجود ہے اور مسلمان ایک دوسرے کی کس طرح مدد کرتے ہیں ___ اُٹھیئے! اور دنیا کو دکھا دیجئے کہ

سچے مسلمان دوسرے مسلمانوں بلکہ دوسرے انسانوں کی مدد کیوں کیا کرتے ہیں اور ان کی مصیبتوں میں کس طرح ان کا ساتھ دیا کرتے ہیں۔

نیت اور عمل

کسی عمل کے اچھے اور بُرے ہونے میں نیت کو بڑا دخل ہوا کرتا ہے۔ کوئی عمل بظاہر کتنا ہی اچھا معلوم ہوتا ہو لیکن اگر اسے انجام دینے والے کی نیّت بری ہے تو وہ عمل بھی بُرا سمجھا جائے گا اور کوئی عقلمند اُس کی تعریف نہیں کر سکتا اسی طرح اگر نیک نیتی کے ساتھ کوئی کام کیا جائے تو عمل خواہ برا ہی کیوں نہ ہو لیکن لوگ اُسے کرنے والے کی مذمت نہیں کرتے کیونکہ اُس کی نیّت خراب نہ تھی۔

مثال کے طور پر کوئی خیرات کرے اور نیت یہ ہو کہ اس سے جرائم پیشہ لوگوں کو مدد ملے اور وہ زیادہ آسانی کے ساتھ جرائم کا ارتکاب کریں یا یہ بھی نہ سہی تو صرف اس غرض سے خیرات دی جائے کہ لوگ ایسے شخص کی تعریف کریں اور اس کی خوب نمائش اور شہرت ہو یعنی اس کام میں جو جذبہ کام کر رہا ہو وہ کسی کی امداد اور اس سے ہمدردی کا نہیں بلکہ

اپنے ذاتی نام و نمود کا ہو تو ایسے عمل کی ہر گز تعریف نہیں کی جاسکتی اسی طرح اگر کسی شخص نے انتہائی خلوص اور پوری ہمدردی کے ساتھ کسی گرتے ہوئے آدمی کو سنبھالنے کی بھرپور کوشش کی مگر اس کو فائدے کے بجائے نقصان پہنچ گیا تو ایسے مدد کرنے والے شخص کی کوئی مذمت نہیں کر سکتا جس نے پورے خلوص نیت کے ساتھ اس کو بچانے کی سعی کی تھی۔ محض اس لئے کہ اس کی نیت بخیر تھی۔ قرآن حکیم میں جا بجا نیت کے ساتھ عمل صالح پر زور دیا گیا ہے۔ آیئے! قرآن پاک کی ابتداء میں دیکھیں تو ہمیں اللہ کا یہ ارشاد بڑی وضاحت کے ساتھ ملتا ہے:

(ترجمہ) اس کتاب یعنی قرآن حکیم میں کوئی شک و شبہ نہیں ہے۔ بیشک یہ پرہیزگار لوگوں کے لئے ہدایت ہے جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں اور نماز کو قائم کرتے ہیں" جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ نماز کو پابندی کے ساتھ ادا کرتے ہیں پھر ارشاد ہوا کہ

"وہ لوگ ایسے ہیں کہ جو کچھ ہم نے انہیں روزی دی ہے اس کو بھی وہ اللہ کی راہ میں خرچ کر دیتے ہیں وہ لوگ ایسے ہیں جو اُن تمام چیزوں پر ایمان رکھتے ہیں (جو اے رسولؐ) تم پر نازل کی گئی ہیں اور اُن چیزوں پر بھی جو تم سے پہلے نازل کی

گئی تھیں اور وہ روزِ حساب پر بھی پورا یقین رکھتے ہیں ایسے ہی لوگ اپنے رب کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں" (البقرہ)

آیات کے اس ترجمہ سے یہ بات پوری وضاحت سے ہمارے سامنے آجاتی ہے کہ اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ نیت کے ساتھ عمل اور عمل کے ساتھ نیت بھی ضروری ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کسی بڑی رکاوٹ کی وجہ سے کسی وقت عمل کا وجود نہ ہوسکے لیکن جذبۂ عمل، عزمِ عمل، اور عمل کے لئے بھرپور مستعدی کا ہونا بہر حال ضروری ہے۔

قرآن و حدیث میں اس بات کے ثبوت میں بہت سے واقعات اور باتیں ملیں گی جہاں نیت کا وجود ہے مگر عمل کا وجود نہیں ہے لیکن کہیں پر یہ نہ ملے گا کہ جذبۂ عمل اور عزم عمل بھی موجود نہ ہو۔

حضرت آدم علیہ السلام کے پورے واقعات کو دیکھ لیجئے ہر جگہ صرف ان کے علم و معرفت ہی کا ذکر ملے گا اور کسی جگہ بھی اسکا تذکرہ نہیں کیا گیا کہ انھوں نے کس کس طرح عبادت کی تھی مگر منصب نبوت ان ہی کو ملا اس لئے کہ ان میں زیادتیِ علم کے ساتھ عزمِ عمل

بھی تھا اور وہ اس بات کیلئے پوری طرح مستعد اور تیار تھے کہ جب اور جو کچھ بھی اللہ کا حکم ہوگا فوراً وہ اس پر عمل کریں گے۔ ظاہر سی بات ہے کہ ایک سچا مسلمان اور پکا مومن دن اور رات کے ہر لمحہ میں تو اعمالِ صالحہ میں مشغول نہیں رہتا اور رہ بھی نہیں سکتا وہ کبھی سو جاتا ہے تو کبھی بیکار بیٹھا رہتا ہے مگر عزمِ عمل اس سے کسی وقت بھی الگ نہیں ہوتا۔ ہمارے سامنے اس بات کی بھی مثالیں موجود ہیں جہاں عمل کا وجود بالکل ہی نہیں ہوسکا اور صرف مستعدی اور عزم عمل ہی تھا مگر اللہ کی بارگاہ میں محض نیّت کو جبکہ وہ عزم و ارادۂ عمل کے ساتھ وابستہ تھی درجۂ قبولیت عطا فرما دیا گیا۔ مسند احمد اور حدیث کی دوسری کتابوں میں موجود ہے کہ غزوۂ اُحد میں عمرو بن ثابت بن وَقَش اسلام لانے کے فوراً بعد کفار کے لشکر سے لڑے اور شہید ہوگئے جبکہ انھوں نے ایک سجدہ بھی اس وقت تک نہیں کیا تھا۔ اور حضورؐ انور نے اُن کی شہادت کی خبر سُن کر فرمایا کہ عمرو بن ثابت شہید ہیں اور اہلِ جنت میں سے ہیں۔ سرورِ کائناتؐ نے ایک حدیث میں فرمایا ہے کہ "لِکُلِّ امْرِئٍ مَّا نَوٰی" یعنی ہر شخص کے عمل کی حیثیت اس کے عزم و نیت سے متعین ہوتی ہے۔ دوسری حدیث میں ہے:

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ" یعنی عمل کے مرتبہ کا تعین نیتوں کے مطابق ہوا کرتا ہے۔

اسی نقطۂ نظر کی طرف اس حدیثِ رسولؐ میں بھی صریحی طور پر اشارہ موجود ہے: اِذَا حَکَمَ الْحَاکِمُ فَاجْتَہَدَ ثُمَّ اَصَابَ فَلَہٗ اَجْرَانِ وَ اِذَا حَکَمَ فَاجْتَہَدَ ثُمَّ اَخْطَاءَ فَلَہٗ اَجْرٌ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۷۶) اگر حاکمِ تبرع کسی حکم دینے میں پوری تحقیق و اجتہاد سے کام لے اور اس کے نتیجے میں صحیح اور درست فیصلہ تک پہنچ جائے تو اُس کے لئے اللہ کی بارگاہ سے دُہرا ثواب عطا ہوگا لیکن اگر اُس حاکم و مجتہد کو باوجود سعیِ بلیغ اور مخلصانہ کوشش کے درست فیصلہ تک رسائی حاصل نہ ہو سکے بلکہ ایسے فیصلے تک رسائی حاصل ہو جو اس کی نظر میں تو صحیح ہو مگر حقیقت میں غلط ہو جب بھی اُس مجتہد و حاکم کو کم از کم ایک اجر ضرور ملے گا کیونکہ فیصلہ خواہ حقیقت اور اصلیت میں غلط ہی کیوں نہ ہو مگر اُس نے خلوصِ نیّت اور سچائی کے ساتھ کوشش تو ضرور کی ہے۔ غرض عمل کی حیثیت کی تشخیص کا انحصار نیّت پر ہے اور نیّت کی اہمیت اور وزن، عمل یا جذبۂ عمل سے وابستہ ہے جس کا خلاصہ یہ ہوا کہ وہ عمل جو بغیر ارادہ اور بغیر نیّت کے ہو کوئی بھی قیمت نہیں رکھتا۔

وہ نیت جو عمل کے ساتھ جذبہ اور ارادے کی حد تک وابستگی نہ رکھتی ہو، کوئی بھی حیثیت و اہمیت نہیں رکھتی۔

جزا و سزا کا تعلق اُن ہی اعمال سے ہے جن میں نیت و ارادہ شامل ہو یا ان نیتوں سے ہے جن میں کم از کم ارادہ اور جذبہ کی حد تک بھی عملی رخ پایا جاتا ہو۔ روزہ میں اگر پانی پینے کا ایک فطری اور بے ساختہ خیال آجائے جبکہ نہ تو پینے کا ارادہ ہی ہو اور نہ پیا ہی جائے تو نہ یہ خیال گناہ ہے اور نہ اس سے روزہ ٹوٹ سکتا ہے لیکن اگر اس خیال اور تصور کو نیت اور ارادہ کی حیثیت بھی حاصل ہو جائے اور روزہ دار یہ طے کر لے کہ اب میں نے روزہ ختم کر دیا اور بس کھانا پانی استعمال کرنا عنقریب شروع کر دوں گا تو اُس کا روزہ باقی نہیں رہ سکتا چاہے وہ کچھ کھائے اور پیئے یا نہیں۔ اسی طرح اگر کوئی زندگی بھر نمازیں پڑھتا رہے اور نیت اس کی نہ ہو کہ وہ نماز پڑھتا ہے بلکہ اس کی نیت ہو کہ وہ ایک قسم کی ورزش کر رہا ہے تو ایسی نماز قطعی طور پر بیکار ہے اور وہ ہرگز اسلامی نماز نہ ہوگی۔

اسی طرح اگر کوئی غیر مسلم یعنی مشرک و کافر محض قرآنی آیات اور اُن کے مفہوم پر اطلاع حاصل کرنے یا اُن کی اپنے خیال میں

رد کرنے کے لئے، قرآن پاک کو پڑھنے لگے تو ظاہر ہے کہ اس قرأت کا ثواب سے کوئی ربط ہی نہیں ہو سکتا بلکہ ثواب اُس مسلمان کو ملے گا جو اُسے اللہ کا کلام سمجھ کر پڑھے گا۔ اسی نقطۂ نظر پر جب ہم قرآن و حدیث کا بغور مطالعہ کرینگے تو ہمیں ہر جگہ نیت و عمل کی وابستگی ملے گی۔ اور حقیقت تو یہ ہے کہ خود نیت کے مفہوم ہی میں عمل کا پہلو شامل ہوتا ہے اس طرح اگر کسی بات کے خیال میں عمل یا جذبۂ عمل کا سرے ہی سے وجود نہ ہو تو وہ تخیل کسی حیثیت سے بھی نیت کا مصداق نہیں بن سکتا۔ علامہ ابو جعفر طوسی علیہ الرحمتہ نے اسی بات کو ان لفظوں میں بیان فرمایا ہے:

اَلنِّيَّةُ هِيَ الْقَصْدُ اِلَى الْفِعْلِ وَهِيَ وَاسِطَةٌ بَيْنَ الْعِلْمِ وَالْعَمَلِ اِذْ مَا لَمْ يُعْلَمِ الشَّيْئُ لَمْ يُمْكِنْ قَصْدُهٗ وَمَا لَمْ يَقْصُدْهُ لَمْ يُصْدَرْ عَنْهُ

(سفینۃ البحار ج ۲ ص ۶۳۷) یعنی نیت سے مراد ہے کسی کام کے کرنے کا ارادہ اور یہ ارادہ علم و عمل کے درمیان ایک واسطہ کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے کہ جب تک کوئی بات علم میں نہ آئے گی اُس وقت تک اُس کو عمل میں لانے کا ارادہ یعنی نیت ممکن ہی نہیں ہو سکتی۔ اِس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نیت صرف تخیل و تصور کا نام نہیں ہے بلکہ اُس تصور کا نام ہے جس کے ساتھ ارادیت

بھی ہو خواہ وہ ارادیت عمل کی صورت اختیار کر سکے یا محض جذبۂ صادق ہی تک محدود رہے۔

آیئے ہم ایک مرتبہ پھر آیات قرآن پاک پر نظر ڈالیں تو سورہ حجرات[۱۵] میں اللہ کا ارشاد ہے۔ (ترجمہ) "یقیناً سچے مومن وہی لوگ ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لے آئے اور اس ایمان کے بعد اُن کے دلوں میں کبھی شک و شبہ نہیں پیدا ہوا اور ساتھ ہی انہوں نے اپنے مال و جان کے ساتھ اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ یہی لوگ صادقین یعنی سچے ایماندار ہیں۔" دیکھئے یہاں بھی ایمان کی ایک شرط نفس و مال کے جہاد کو قرار دیا گیا ہے۔ اس مقام پر یہ بات واضح رہے کہ اس جہاد سے صرف میدان جنگ کی لڑائی ہی مراد نہیں ہے بلکہ اس سے احکام خداوندی پر عمل کرنے کی ہر وہ کوشش مراد ہے جس کا تعلق مرد مسلم کی زندگی کے کسی رخ یا کسی میدان سے کیوں نہ ہو۔ ایک دوسری آیت سورۂ لنساء (۱۲۴) میں ہے (ترجمہ) "اور جو کوئی نیک اعمال کرے گا خواہ مرد ہو یا عورت ہو جبکہ وہ مؤمن بھی ہو تو ایسے سب لوگ جنت میں داخل ہوں گے"۔ یہاں بھی دخولِ جنت کی شرط ایمان ہے اور ایمان و عملِ صالح دونوں باہم ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ یعنی عملِ صالح کی تکمیل ایمان

سے ہو گی اور خود ایمان مفید و مؤثر صرف اسی وقت ہو گا جبکہ اُس کے ساتھ عمل صالح یا جذبہ و استعدادِ عمل صالح موجود ہو۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ کے ذکر سے اس بات کی مزید وضاحت ہو گی جنگِ خندق میں جب شیرِ خدا امیر المؤمنین حضرت علی علیہ السلام عمرو بن عبدوُد کے سینے پر آئے اور چاہا کہ اُس کا سر الگ کر دیں۔ عین اُسی وقت اُس نے آپ کی شانِ اقدس میں انتہائی فحش الفاظ کہے اور آپ کی طرف تھوک کر بے ادبی بھی کی۔ سرورِ کائنات ؐ اور اصحاب کرام رضؓ دور سے یہ سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ حضرت امیر المؤمنین علیہ السلام نے اس کو فوراً چھوڑ دیا اور اُس کے سینے سے اُتر آئے اور تھوڑی دیر کے بعد پھر اُس کے پاس جا کر اُس کے سر کو جدا کر دیا۔ واپسی پر جب حضورِ انور ؐ نے آپ سے دریافت کیا کہ پہلی مرتبہ تم نے علیؑ! اسے کیوں چھوڑ دیا تھا تو آپ نے عرض کی یا رسول ؐ اللہ اُس کی بے ادبی سے مجھے غصہ آ گیا تھا۔ اگر میں اُس وقت اُسے قتل کرتا تو میری نیت انتقامی ہوتی اور یہ قتل اللہ کے لئے نہ ہوتا اِس لئے میں نے صبر سے کام لیا تاکہ میرا یہ عمل خالصًا لوجہ اللہ ہو اور میری نیت میں کوئی دوسرا جذبہ نہ آنے پائے۔

صفائی اور پاکیزگی

اسلام نے ہر شخص کو پاک اور صاف رہنے کی ہدایت کی ہے چاہے اسکا تعلق اسکی اپنی ذات سے ہو یا اسکے ماحول سے ہو۔ قرآن وحدیث میں اسکی اتنی تاکید ہے کہ اسے خدا کی محبت اور رحمت کے حصول کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ قرآن حکیم کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَیُحِبُّ الْمُتَطَہِّرِیْنَ (البقرۃ/۲۲۲) اللہ توبہ کرنے والوں اور صاف ستھرے لوگوں کو دوست رکھتا ہے۔ اسکا مطلب یہی ہوا کہ وہ ان لوگوں سے محبت نہیں فرماتا اور انکو پسند نہیں کرتا جو گندے اور نجس ہوں اور پاک و صاف نہ رہتے ہوں۔ اس صفائی اور پاکیزگی کا تعلق آدمی کے ظاہر و باطن دونوں باتوں سے ہے اور "ظاہر" سے مراد صرف اسکا اپنا جسم اور کپڑے ہی نہیں ہیں بلکہ وہ پورا ماحول ہے جسمیں وہ زندگی گذارتا ہے اور جس سے کسی طرح کا بھی اسکی زندگی سے تعلق ہو سکتا ہے۔ صفائی اور طہارت کے اس ضروری مقصد کو حاصل کرنے کے لیئے ہمیں اسلام نے بہت سے طریقے بتائے ہیں مثلاً عبادتیں کس طرح کی جائیں اور ان کے لیئے طہارت اور پاکیزگی کتنی ضروری ہے۔ مسجد میں نجاست کی حالت میں رہنا ممنوع ہے۔ کثیر موقعوں پر غسل کرنا

کبھی واجب اور کبھی مستحب قرار دیا گیا ہے۔ جمعہ کے دن خاص طریقہ پر بڑی تاکید ہے کہ نماز جمعہ سے پہلے غسل کیا جائے اور پاک وصاف ہو کر جماعت کی نماز میں شرکت کی جائے تاکہ کسی شخص کی گندگی اور جسم کی بدبو سے دوسرے نمازیوں کو تکلیف نہ پہنچے۔ جمعہ کے علاوہ دوسرے دنوں میں بھی صفائی اور پاکیزگی کی تاکید کی گئی ہے چنانچہ سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شخص کو دیکھا کہ وہ میلے کچیلے کپڑے پہنے ہوئے ہے۔ یہ دیکھ کر آپ نے ارشاد کیا: کیا اس کو پانی میسر نہ تھا کہ یہ کپڑے دھو کر صاف کر لیتا"۔

اس حدیث سے اس بات کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام میں صاف اور پاک رہنے کا کیا مرتبہ ہے۔

یہ بات تو ہم سب ہی جانتے ہیں کہ ہر بالغ مسلمان پر نماز پڑھنا فرض ہے اور ظاہر ہے کہ نماز فرض ہو یا نفل ہو بغیر اس طہارت کے نہیں ہو سکتی جس کے تمام طریقے شریعت نے ہم کو بتا دیئے ہیں۔ اور ہر نماز پڑھنے والے کے لیئے یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ اپنے بدن، اپنے کپڑوں اور نماز پڑھنے کی جگہ سے نجاست کو دور کرے۔ اس طرح اس کا یہ لازمی نتیجہ نکلے گا کہ جو شخص دن اور رات کی تمام نمازوں اور دوسری عبادتوں کیلیئے صاف اور پاک رہنے کا عادی بن جائے گا وہ پھر اور

وقتوں میں بھی ناپاک اور گندہ نہیں رہ سکتا۔

سوکر اٹھنے کے بعد یا کھانے کے پہلے اور اس کے بعد دانتوں اور ہاتھوں کی صفائی پر بہت زور دیا گیا ہے جس کی وجہ سے بہت سے زہریلے جراثیم اور کثیر بیماریوں سے محفوظ رہا جا سکتا ہے۔ اس صورت سے اسلام نے ہر مسلمان کو اس کے کپڑوں اس کے بدن اور اسکی عبادت کی جگہوں کی پاکیزگی اور طہارت کا حکم دے کر اس کے مزاج میں پاکیزگی کو داخل کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے اور یقینی طور پر جو شخص بھی ہر وقت اور ہر لمحہ میں صفائی کا اس قدر خیال رکھے گا تو وہ پھر کبھی گندے ماحول کو پسند نہیں کر سکتا۔

ان تمام احکام اور ہدایات میں ایک بنیادی بات یہ بھی ہے کہ گندگی اور نجاست اور صاف ستھرا نہ ہونا خواہ انسان کے اپنے بدن سے اس کا تعلق ہو یا اس کے ماحول سے ہو خود اس کی اور دوسرے لوگوں کی زندگی کے لیے خطرہ سے خالی نہیں ہے اور اس خطرہ کو دور کرنا شرعی طور پر ہر مسلمان کے لیئے ضروری ہے اور اگر وہ اپنے اس فرض کو پورا کرنے میں غفلت سے کام لیگا تو وہ خود اپنی صحت اور زندگی کی تباہی کے ساتھ ہی اس پورے نقصان کا بھی ذمہ دار ہو گا جو اس کی اس لاپرواہی اور غفلت کی وجہ سے معاشرہ کے دوسرے افراد کو پہنچے گا۔

یہ تو ظاہر بات ہے کہ ایک آدمی تنہا پورے شہر یا پورے ملک کو صاف ستھرا نہیں کر سکتا لیکن یہ تو کر سکتا ہے کہ اپنے بدن، اپنے کپڑوں اپنے گھر اور گھر کے باہر جس حد تک بھی اس کیلئے آسانی سے ممکن ہو صفائی رکھے اور گندگی نہ پیدا ہونے دے تاکہ اس سے جو برائیاں اور خرابیاں پھیل سکتی ہیں ان کی ذمہ داری اس شخص پر اور اس کے گھر والوں پر نہ آسکے اگر معاشرہ کا ہر فرد اور ہر گھر اس کی عادت اختیار کر لے اور اس انفرادی ذمہ داری کو پورا کرتا رہے تو آخر میں پھر یہ انفرادی کام اجتماعی شکل اختیار کر لیگا اور پورا محلہ، سارا شہر اور تمام ملک صاف ستھرا ہو جائیگا اور پورے معاشرے سے وہ خطرے دور ہو سکیں گے جو گندگی کی وجہ سے پیدا ہونا ممکن ہیں۔ اس طرح ہر ایک کی انفرادی کوشش پورے معاشرہ کو صاف ستھرا بنا سکتی ہے۔ اور جب تمام معاشرہ میں صفائی اور پاکیزگی عام ہو جائے گی تو اس کا فائدہ لازمی طور پر پلٹ کر پھر ان ہی افراد تک پہنچے گا اور یوں وہ تمام خطرے جو انسانی زندگی کو کسی وقت بھی تباہ کر سکتے ہیں دور ہو جائیں گے۔

قرآن حکیم میں بہت سے مقامات پر طہارت اور پاکیزگی کی اس بنیادی تعلیم پر ہدایات موجود ہیں سورۂ بقرہ کے علاوہ جس کا ذکر کیا جا چکا ہے سورۂ مائدہ میں بھی ارشاد ہوتا ہے " اللہ اس کا ارادہ

کرنا ہے کہ تمہیں پاک کردے اور اپنی نعمتیں تم پر تمام کردے تاکہ تم اس کے شکر گزار بن جاؤ (مائدہ/۵/۶) پھر سورۂ المدّثّر میں نبی کریمؐ سے اس طرح خطاب ہوا ہے: "وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ" اپنے کپڑوں کو پاک رکھو اور شرک سے الگ تھلگ رہو۔ بہت آسانی کے ساتھ ہمیں ان آیات کو سمجھنے کے بعد یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ خدا کے نزدیک پاکیزگی اور لطافت و طہارت کس قدر ضروری ہے۔

سرورِ کائنات کی بہت سی حدیثیں صاف اور صریح طریقہ پر اس اہم تعلیم کی طرف ہدایت کرتی ہیں۔ آپ فرماتے ہیں۔ غَسْلُ الْاِنَاءِ وَطَهَارَةُ الْفِنَاءِ يُوْرِثَانِ الْغِنٰى "برتنوں کو دھونے اور صحن کو یعنی مکان کو صاف رکھنے سے آدمی کی احتیاج اور اس کا افلاس اور تنگدستی دور ہوتی ہے اور وہ دولتمند اور غنی ہو جاتا ہے۔ ایک حدیث میں ارشاد ہوا ہے: بُنِيَ الدِّيْنُ عَلَى النَّظَافَةِ "دین کی بنیاد پاکیزگی اور طہارت پر ہے۔ ایک اور حدیث میں ارشاد ہوا ہے: اِنَّ اللّٰهَ طَيِّبٌ يُحِبُّ الطَّيِّبَ "خدا پاک ہے اور پاک اور صاف (شخص) کو محبوب رکھتا ہے، نَظِيْفٌ يُحِبُّ النَّظَافَةَ "وہ پاکیزہ ہے اور پاکیزگی کو دوست رکھتا ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہوا ہے: فَنَظِّفُوْا اَفْنِيَتَكُمْ وَسَاحَاتِكُمْ "اس لیئے تم اپنے گھروں کے اندرونی اور بیرونی صحنوں کو صاف

ستھرا رکھو اس کا مطلب یہ ہے کہ گھروں کے اندر اور ان کے باہر کے وہ حصے جو اُن سے متصل ہیں ان میں بھی پوری صفائی کا لحاظ رکھا جانا چاہیئے۔ ایک حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ لطافت یعنی پاکیزگی اور ستھراپن ایمان کی طرف دعوت دیتا ہے۔ غرض ان تمام آیات اور حدیثوں سے اس حقیقت کو سمجھا جاسکتا ہے کہ اسلام کے نزدیک بدن، کپڑوں اور ماحول کی صفائی کی کسقدر اہمیت ہے اور صاف ستھرے لوگ خدا اور رسول کی نظر میں کیا مرتبہ رکھتے ہیں اس لیئے ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ خدا اور رسول کے ان احکام سے غفلت نہ کرے۔ اسکو ان احکام الٰہیہ پر عمل کرنے سے دنیا میں بھی ہر طرح کا فائدہ حاصل ہوگا اور آخرت کا ثواب بھی ملیگا اسکے ساتھ ہی اس ضروری کام کے انجام دینے میں ہر شخص کو خود پہل کرنے کی کوشش کرنا چاہیئے اور اس کا انتظار نہ کرنا چاہیئے کہ دوسرا آکر اس کام کو پورا کر دیگا اور اس کے انتظار میں وہ اپنے ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے کیونکہ یہ ہر مسلمان کی ذاتی ذمہ داری ہے، اور اسمیں اسکو کسی دوسرے کا انتظار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ خدا ہم سب کو اسکی توفیق عطا فرمائے کہ ہم صفائی کی برکتوں کو حاصل کریں۔ تمام برائیوں اور نجاستوں سے اپنے ظاہر و باطن اور اپنے ماحول کو اسطرح پاک اور صاف رکھیں جسطرح خدا نے ہم کو حکم دیا ہے۔

حجرۂ نبویؐ اور بیتِ فاطمہؑ

مکۂ مکرمہ سے ہجرت کرنے کے بعد سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب مدینۂ طیبہ میں تشریف لائے تو سات ماہ تک حضرت ایوبؓ انصاری کے مکان میں مقیم رہے پھر سب کاموں سے زیادہ اس بات کی فکر ہوئی کہ مسجد تعمیر کی جائے تاکہ وہاں سہولت کے ساتھ سب لوگ نماز جماعت اور نماز جمعہ کے لیے حاضر ہوتے رہیں چنانچہ حضرتِ ایوبؓ انصاری کے یہاں قیام ہی کے زمانہ سے مسجد کی تعمیر کا کام شروع ہو گیا تھا۔ جو زمین مسجد کے لیے خریدی گئی وہ خاندانِ نجار کے دو یتیموں کی تھی اس مسجد کی تعمیر میں خود حضورِ انورؐ بھی شریک رہے اور پتھر اٹھا اٹھا کر لاتے تھے۔ اور فرماتے جاتے تھے:۔ اللّٰھم لا خیرَ اِلّا خیرُ الاٰخِرۃ + فَاغْفِرِ الانصار وَالْمھاجرۃ — اے اللہ! کامیابی تو صرف آخرت ہی کی کامیابی ہے۔ اے اللہ

مہاجرین و انصار کو بخش دے۔

اس مسجد کی دیواریں کچی اینٹوں کی تھیں اور ستون کھجور کی شاخوں کے اور چھت کھجور کے پتوں سے بنی تھی۔

مسجد نبویؐ کی تعمیر کے بعد اسی سے متصل آپ نے اپنا حجرہ بھی تعمیر کرایا۔ اس وقت تک حضرت سودہؓ بنت زمعہ کے ساتھ حضورؐ کا عقد ہو چکا تھا اور حضرت عائشہ رضی بھی عقد آں حضرتؐ میں آ چکی تھیں اسلئے یہ دو حجرے ازواج رسولؐ کے مسجد ہی سے متصل تھے۔ اور ایک حجرہ اپنی چہیتی بیٹی حضرت فاطمہ زہراؑ کے لیے بنوایا جس میں حضرت علی بن ابی طالب اور حضرت سیدۂ عالم علیہا السلام کی رہائش تھی یہ مکانات بھی کچی اینٹوں کے تھے اور ان کے اندر جو حجرے تھے وہ کھجور کی ٹہنیوں سے بنے تھے اور ان کے دروازوں پر کمل کے پردے پڑے رہتے تھے۔ ان دو امہات المومنین کے علاوہ دوسری ازواج مطہرات کے حجرے بعد میں بنائے گئے تھے۔ حجرۂ رسولؐ اکرم کے متصل ہی حجرۂ حضرت فاطمہ زہراؑ بھی تھا۔ اصحابؓ کرام نے بھی مسجد نبیؐ سے متصل اپنے مکانات بنوا لیے تھے۔ ان تمام مکانات کے دروازے

مسجد کے صحن ہی کی طرف کھلتے تھے اور صحابہؓ کرام ہر حالت میں مسجد کے صحن ہی سے گذرا کرتے تھے۔ مگر کچھ ہی روز میں وحی الٰہی کے تحت سرورؐ دو عالم نے اصحابؓ کرام کو حکم دیا کہ اپنے مکانات کے دروازے دوسری جانب بنالیں اور مسجد کی طرف کے دروازے بند کردیں سوائے بنت فاطمہ علیہا السلام کے جس میں اُن کے ساتھ حضرتِ شیرِ خدا علی بن ابی طالب علیہ السلام کا قیام تھا اور پھر منبر پر تشریف لاکر اعلان فرمادیا کہ سوائے میرےؐ اور علیؑ و فاطمہؑ کے گھر کے تمام گھروں کے دروازے مسجد کی طرف سے بند کردیئے جائیں اور سورۂ والنجم کی ابتدائی آیات کی تلاوت فرمائی جس میں اللہ نے فرمایا ہے کہ ہمارے رسولؐ اپنی خواہشِ نفس سے کچھ نہیں بولتے بلکہ جو کچھ وہ کہتے ہیں وحی الٰہی کے مطابق کہتے ہیں۔ محدثینِ السلام نے اس واقعہ کو بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ عہدِ نبویؐ کے بعد مختلف زمانوں میں مسجد میں وسعت ہوتی رہی اور ولید بن عبد الملک کے دورِ

عہ آپکے حجرے وہی تھے جن میں آپ کی ازواج تھیں۔

خلافت میں حجرۂ بنوی، بیتِ فاطمہؓ اور دوسرے تمام حجرے اور مکانات مسجد میں شامل کرلیئے گئے۔

مسجد نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جنوب مشرقی سمت میں سرکارِ دوعالم کا حجرہ ہے اور وہی حضورؐ کا مدفنِ مبارک ہے۔ اس کے قریب ہی حضرتِ فاطمہ زہرا علیہا السلام کے گھر کی وہ جگہ ہے جہاں آپ کا اور امیر المؤمنین حضرت علیؑ کا قیام تھا اور بعض روایتوں کی بنا پر اسی جگہ پارۂ جگرِ رسولؐ حضرتِ سیدۂ عالم کی قبرِ مطہر ہے۔ حجرۂ بنوی کی ابتدائی تعمیر اموی خلیفہ حضرتِ عمر بن عبدالعزیز نے کرائی تھی۔

چونکہ امیر المؤمنین حضرت علیؑ نے قبرِ سیدۂ عالم کو پوشیدہ کردیا تھا اس لیئے اس کا احتمال ہے کہ آپ کی قبرِ مطہر مسجد نبوی کے احاطہ میں ہو یعنی منبر و قبر انورِ سرکارِ دوعالم کے درمیان۔ جس کے لیئے حضورؐ اکرم نے ایک حدیث میں فرمایا ہے: مَا بَیْنَ بَیْتِیْ وَمِنْبَرِیْ رَوْضَۃٌ مِنْ رِیَاضِ الْجَنَّۃِ "میرے گھر اور میرے منبر کے درمیان جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا

پھر حضورِ انور کے پائینتی جہاں بیت سیدۂ عالم واقع تھا۔ جس طرح اس کا بھی احتمال ہے کہ آپ کی قبر مبارک جنت البقیع میں ہو اور اسی بنا پر ان تمام مقامات پر حضرتِ سیدۂ عالم کی زیارت پڑھی جاتی ہے۔

حضرت ابوذر غفاری رض

مسلمانوں کے فتوحات کا سیلاب کرۂ زمین کے دور دراز کناروں تک پہنچ چکا تھا۔ بحیرۂ روم کے زرخیز جزیرے اور عربستان کے مالدار خطے شام و فلسطین کے اہم ترین مقامات اور افریقہ کی سونا اگلنے والی زمینیں ان کے قبضہ میں آچکی تھیں۔

جزیرۂ قبرص (Cyprus) پر اسلامی جھنڈا لہرا رہا تھا۔ وہاں کی فتح کے بعد مال غنیمت بہت زیادہ مقدار میں حاصل ہوا اور کثیر تعداد میں لوگوں کو غلام بنایا گیا۔

حضرت ابوذر رض اس زمانے میں شام میں تھے۔ وہاں یہ اسلامی مساوات کی تبلیغ کا فرض انجام دے رہے تھے۔ وہ جب غریبوں کی حالت کو دیکھتے تھے تو پھوٹ پھوٹ کر رو دیا کرتے تھے اور اکثر اوقات دولتمندوں کے سامنے قرآن حکیم کی یہ آیتیں پڑھا کرتے تھے:۔

وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۝ يَّوْمَ يُحْمٰى عَلَيْهَا

فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ فَتُکْوٰی بِھَا جِبَاھُھُمْ وَ جُنُوْبُھُمْ وَ ظُھُوْرُھُمْ ط
ھٰذَا مَا کَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ فَذُوْقُوْا مَا کُنْتُمْ تَکْنِزُوْنَ ہ (التوبہ ۳۴، ۳۵)

اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے (اے رسولؐ) اُن کو دردناک عذاب کی خبر سُنا دو، جس روز وہ سونا چاندی جہنم کی آگ میں گرم کیا جائے گا پھر اُس سے اُن کی پیشانیاں اور اُن کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی اور اُن سے کہا جائے گا کہ یہ وہی ہے جسے تم نے دنیا میں اپنے لئے جمع کر رکھا تھا تو اب تم اپنے جمع کئے ہوئے مال کا مزہ چکھو۔ سرمایہ دار لوگ حضرت ابوذرؓ کی ان باتوں کو برداشت نہ کر سکے اور نتیجہ میں اُن کو شام کے خطّے سے نکال دیا گیا۔ آپ ہمیشہ یہ کہا کرتے تھے کہ "میں حق بات کہنے سے باز نہیں رہ سکتا، جہاں کہیں رہوں گا کبھی سچ بات کہنے سے نہیں رکوں گا"

حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السّلام نے حضرت ابوذرؓ کے بارے میں حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ حدیث بیان فرمائی ہے: مَا اَظَلَّتِ الْخَضْرَاءُ وَلَا اَقَلَّتِ الْغَبْرَاءُ مِنْ ذِیْ لَھْجَۃٍ اَصْدَقَ مِنْ اَبِیْ ذَرٍّ" آسمان نے سایہ نہیں ڈالا اور نہ زمین نے کسی شخص کو اپنے اوپر اٹھایا جو ابوذرؓ سے زیادہ سچا ہو۔ کسی شخص

نے امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس حدیثِ رسول اللہ کے متعلق دریافت کیا۔ آپ نے کہا کہ واقعی یہ حدیثِ رسولؐ ہے اور سرورِؐ دو عالم نے ابوذرؓ کی ان ہی لفظوں کے ساتھ تعریف فرمائی ہے لوگوں نے پھر پوچھا کہ "فَاَیْنَ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَاَمِیْرُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْحَسَنُ وَالْحُسَیْنُ" تو اب رسولؐ اللہ اور حضرت علیؑ اور حسنین علیہم السلام کا مرتبہ کیا ہے؟ یہ سن کر امام جعفر صادق علیہ السلام نے پوچھا کہ سال میں کس قدر مہینے ہوا کرتے ہیں۔ سوال کرنے والے نے کہا" بارہ مہینے۔ آپ نے فرمایا" ان بارہ مہینوں میں حرمت والے مہینے جن کی حرمت و عزت کی وجہ سے الغیر "اَشْہُرُ حُرُم" کہا جاتا ہے کتنے ہیں۔ اس نے جواب دیا "چار مہینے" ذلیقعدہ، ذی الحجہ، محرم اور رجب۔ آپ نے فرمایا ماہِ رمضان ان مہینوں میں داخل نہیں ہے حالانکہ وہ ان سب سے افضل ہے۔ اسلئے محمدؐ و آل محمدؐ پر کسی دوسرے کا قیاس نہ کرو۔ حضرت ابوذرؓ نے اسلامی مساوات کا درس دینے میں اپنی پوری زندگی ختم کردی اور اس راہ میں سخت ترین مصیبتیں اٹھائیں، سرمایہ داروں کی ناراضی مول لی اور دنیا کی ہر راحت و آرام سے محروم ہو گئے۔ حضرت علیؑ ان سے فرمایا کرتے تھے "یَا اَبَاذَرٍ اِنَّکَ غَضِبْتَ لِلّٰہِ فَارْجُ مَنْ غَضِبْتَ لَہٗ" اے ابوذر تم اللہ کے لئے لوگوں سے ناراض ہوتے ہو تو جس کے لئے

تم لوگوں سے ناراض ہوتے ہو یعنی اللہ اس کی ذات سے ثواب کی امید رکھو۔ لوگ تم سے اس وجہ سے ڈرتے ہیں کہ کہیں تمہاری باتوں کے سبب سے ان کی دنیا ان کے ہاتھوں سے نہ نکل جائے اور تم اُن سے اس لئے خوف کرتے ہو کہ تمہارے دین کو وہ کہیں نقصان نہ پہنچادیں تو پھر تم اے ابوذر اُس چیز کو جس کی وجہ سے لوگ تم سے خوف رکھتے ہیں اُن کے ہاتھوں میں چھوڑ دو اور اُس چیز کو لیکر دور نکل جاؤ جس کے زوال کے لئے تمہیں اُن سے خوف ہے۔ حضرت ابوذر کو جب "ربذہ" جانے کا حکم ملا جو مدینہ سے نزدیک تھا تو انھوں نے زور سے تکبیر کہی اور کہا کہ میرا رسولؐ سچا تھا۔ انہوں نے پہلے ہی مجھے اس کی خبر دیدی تھی اور جو کچھ بھی مجھ پر مصائب پڑے ہیں، سب بتادیئے تھے۔ حضور انورؐ نے مجھے خبر دی تھی کہ میری وفات نہ مکہ میں ہوگی اور نہ مدینہ میں بلکہ میں "ربذہ" کے صحرا میں وفات پاؤں گا۔ اور میرے غسل و کفن اور دفن کا انتظام کچھ لوگ کریں گے جو عراق سے سفر کرتے ہوئے حجاز کی طرف آرہے ہوں گے۔ حضرت ابوذرؓ جب "ربذہ" کی طرف آرہے تھے تو اُن کو رخصت کرنے کے لئے حضرت علیؑ، حضرت امام حسنؑ، حضرت امام حسینؑ، حضرت عقیلؓ بن ابی طالب اور حضرت عمار یاسرؓ موجود تھے۔ ابوذرؓ ان سب کو دیکھ کر زار و قطار

رونے لگے اور کہا: بِاَبِیْ وُجُوْہًا اِذَا رَاَیْتُهَا ذَکَرْتُ بِهَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَشَمَلَتْنِیْ بَرَکَتُہٗ بِرُؤْیَتِهَا " میرا باپ ان چہرں پر قربان ہوجائے جنہیں میں دیکھتا ہوں تو مجھ کو رسول اللہ یاد آجاتے ہیں اور ان لوگوں کی زیارت کی وجہ سے مجھے برکت و رحمت گھیر لیتی ہے اس کے بعد آسمان کی طرف ہاتھ اٹھائے اور آواز دی: پروردگار! تو گواہ رہنا کہ میں ان لوگوں کو بہت درست رکھتا ہوں چاہے ان کی محبت میں میرا بدن ہی ٹکڑے ٹکڑے کیوں نہ ہو جائے۔

ایک مرتبہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوذر رضؓ کے تقدس اور پرہیزگاری کا اس طرح امتحان لیا تھا کہ ایک غلام کو بلاکر روپیہ بھر کر ایک بڑی تھیلی اُس کے سپرد کی اور کہا کہ ابوذر کے پاس جا اور یہ تھیلی اُن کو دیدے۔ اگر تیرے ہاتھ سے انھوں نے یہ تھیلی قبول کرلی تو میں تجھے فوراً آزاد کر دونگا۔ یہ خوشخبری سُن کر غلام نے وہ تھیلی اٹھائی اور خوش ہو کر جلدی جلدی حضرت ابوذر رضؓ کے پاس گیا اور تھیلی اُن کے سامنے پیش کردی۔ مگر حضرت ابوذر رضؓ نے اس کو قبول نہ کیا۔ غلام گھبراگیا اور کہنے لگا کہ اگر آپ اسے قبول کرلینگے تو میں آزاد ہو جاؤنگا اور آپ کا میری ذات پر یہ ایک احسان عظیم ہوگا۔ حضرت ابوذر رضؓ نے جواب دیا کہ یہ بات درست ہے مگر تم تو آزاد ہو جاؤ گے اور میں روپیہ

لے لینے کے بعد اپنی آزادی کھو بیٹھوں گا اور دوسروں کا غلام بن جاؤں گا۔ اس لئے، میں اس مال کو قبول کرنے سے معذور ہوں۔

حضرت ابوذرؓ جب "رَبذَہ" میں گئے تو آپ کے ساتھ آپ کی بیٹی بھی تھی۔ کچھ روز کے بعد جب انکے ساتھ کا تمام سامان ختم ہو گیا اور کھانے پینے کی کوئی چیز نہ رہی تو فاقہ کرنے لگے اور آخر بیماری اور غذا کے نہ ملنے کی وجہ سے اُسی صحرا میں انتقال فرمایا۔

بیٹی حیران و پریشان تھی کہ باپ کو کس طرح دفن کرے، کیونکر غسل دے، کس طرح کفن پہنائے۔ آخر ابوذرؓ کی وصیت کے مطابق عراق کے راستہ پر بیٹھکر انتظار کرنے لگی۔ اُسی پریشانی کے عالم میں ایک قافلہ آتا ہوا نظر آیا۔ جس میں حضرت مالکؓ بن اُشتر بھی تھے جب دختر ابوذرؓ نے اُن کو صحابی رسول صلعم اللہ کے انتقال کی خبر دی تو انھوں نے اور اُن کے ساتھیوں نے فوراً اپنی سواریوں سے اُتر کر صحابی رسول صلعم کو غسل و کفن دیا اور وہیں دفن کیا۔

حضرت ابوذرؓ کا اصلی نام جُندَب بن جُنادَہ تھا اور یہ قبیلہ بنو غِفار میں پیدا ہوئے تھے۔ ۳۲ھ میں وفات پائی۔ سب سے پہلے ایمان لانے والوں میں ان کا نمبر چوتھا یا پانچواں تھا۔ بخاری اور مسلم میں ان سے ۲۸۱ حدیثیں روایت کی گئی ہیں۔

اِس طرح یہ مساواتِ اسلامی کا عظیم علم بردار ہمیشہ کیلیے خاموش ہو گیا۔ اگرچہ اُس کی زبان چُپ ہو گئی ہے لیکن اُس سے نکلے ہوئے لفظ کائنات کی فضا میں نقشِ دوام بن کر ہمیشہ ہمیشہ ثبت رہیں گے۔

قدرتی وسائلِ رزق سے استفادہ

قدرتی وسائل رزق پر غور کرنے کے سلسلہ میں ہمیں اس موضوع کے چار پہلوؤں پر بنیادی حیثیت سے بحث کرنا ضروری ہوگا۔ ایک یہ کہ وہ وسائلِ رزق کیا ہیں۔ دوسرے یہ کہ ہم ان وسائل سے استفادہ کی صلاحیت بھی رکھتے ہیں یا نہیں۔ تیسری بحث یہ ہوگی کہ اگر ہم میں صلاحیت بھی موجود ہے تو ہم ان وسائل کو کس طرح حاصل کریں اور کس طرح حاصل کر سکتے ہیں اور چوتھا رُخ اس گفتگو کا یہ ہے کہ اِن وسائل کے حصول کے بعد انھیں کس طرح کام میں لایا جائے۔ اور اُن سے کس طرح اور کس حد تک فائدہ اٹھایا جائے۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے یعنی یہ کہ وہ وسائلِ رزق کیا ہیں اس کو قرآنِ حکیم نے اس قدر تفصیل اور شرح سے بیان کر دیا ہے جسے ایک معمولی عقل رکھنے والا بھی آسانی کے ساتھ سمجھ سکتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں اس وقت میں

چند آیات اور ان کے مفہوم کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرتا ہوں۔ سورۂ لقمان میں اللہ کا ارشاد ہے: اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَیْکُمْ نِعَمَہٗ ظَاھِرَۃً وَّ بَاطِنَۃً۔ کیا تم لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ اللہ نے جو کچھ تمام آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین ہے وہ سب کا سب تمہارے لیے مسخر کردیا ہے اور اس نے اپنی تمام ظاہری اور باطنی نعمتیں تم پر پوری کردی ہیں۔ سورۂ حج میں اس طرح فرمایا گیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے: کیا تم کو یہ نظر نہیں آتا کہ اللہ نے جو کچھ زمین میں موجود ہے وہ سب تمہارا تابع بنا دیا ہے۔ ان آیات سے ہمیں یہ بات صاف طور پر معلوم ہو جاتی ہے کہ زمین و آسمان کی جس قدر بھی چیزیں ہیں وہ سب ہمارے ہی لیے پیدا کی گئی ہیں اور اسی حقیقت کی طرف قرآن حکیم نے دوسرے مقامات پر بڑی تفصیل سے اشارے فرمائے ہیں اور بتایا ہے کہ چاند اور سورج، دن اور رات، پہاڑ اور سمندر، ندیاں اور آبشار، بادل اور بارش، برق و باد اور برگ و ثمر، چوپائے، پرند، سبزہ زاریں اور جڑی بوٹیاں، رنگ رنگ کے حسین وجمیل پھول بوٹے اور طرح طرح کے درخت اور ان کے میوے یہ ساری چیزیں صرف ہمارے

لیئے بنی ہیں اور انھیں ہماری زندگی اور ہماری آسائش کا وسیلہ قرار دیا گیا ہے۔ سورۂ بقرہ[۲۷] میں ارشاد ہوا ہے ترجمہ یہ ہے (تمہارا پروردگار ہی تو ہے) جس نے تمہارے لیئے زمین کو فراش یعنی رہنے کے قابل بنایا اور آسمان کو چھت کی طرح بنایا اور آسمان سے پانی برسایا اور اس پانی کے ذریعہ سے تمہارے لیئے پھل پیدا کیئے جنہیں اس نے تمہارا رزق بنایا ہے اس لیئے تم خدا کے ساتھ کسی اور کو اس کا شریک نہ بناؤ۔ سورۂ الذّاریات[۲۷] میں اسی حقیقت کو یوں بیان کیا گیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے: آسمان میں تمہارا رزق موجود ہے اور وہ سب کچھ موجود ہے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔ سورۂ الملک[۱۵] میں زمین میں پھیلے ہوئے وسائلِ رزق کی طرف اس طرح اشارہ کیا گیا ہے: هُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ ذَلُوْلًا فَامْشُوْا فِيْ مَنَاكِبِهَا وَكُلُوْا مِنْ رِّزْقِهٖ: وہی اللہ تو ہے جس نے تمہارے لیئے زمین کو مسخر کیا ہے اس لیئے تم اس میں چلو پھرو اور اللہ کے عطا کیئے ہوئے رزق کو حاصل کرو۔ سورۂ حجر میں کچھ اس طرح فرمایا گیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے[۲۰]: ہم نے زمین میں تمہارے لیئے معاش کے تمام سامان پیدا کر دیئے

ہیں اور اس مخلوق کے لیئے بھی جسے تم روزی نہیں دیتے ہو۔ غرض قرآنِ حکیم اوّل سے آخر تک اسی طرح کے ارشادات سے بھرا ہوا ہے جن سے یہ حقیقت پوری طرح صاف ہو جاتی ہے کہ بنی نوع انسان کے لیئے کائنات کی ہر چیز بنی ہے اور زمین و آسمان میں ہر طرف انسان کے لیئے وسائل رزق پھیلے ہوئے ہیں۔ ساتھ ہی قرآن حکیم کے اس اعلان عام سے کہ زمین و آسمان کی ہر چیز اللہ نے انسان ہی کے لیئے بنائی ہے اور ہر چیز کو اسی کے کام میں لگا دیا ہے اور اس کا تابع و مسخر کر دیا ہے، یہ بات خود بخود ثابت ہو جاتی ہے کہ انسان میں ان تمام وسائل سے استفادہ کی پوری صلاحیت و قابلیت موجود ہے۔ وہ زمین اور پہاڑوں کے چپہ چپہ میں جا سکتا ہے اور اپنے وسائلِ زندگی تلاش کر سکتا ہے، وہ فضاؤں کی لامحدود پہنائیوں میں اتر سکتا ہے، وہ سیاروں پر پہنچ سکتا ہے، وہ ستاروں کی بلندیوں کو شکست دے سکتا ہے، وہ فضاؤں پر بھی حکمرانی کر سکتا ہے، وہ وادی و کہسار پر بھی اپنی طاقت کے سکے جما سکتا ہے۔ آسمان کے ستارے اس کے لیئے ہیں، بارش کے قطرے اس کے لیئے ہیں، زمین کے ذرّے اس کے لیئے ہیں۔ اس طرح

اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہوا کہ انسان کے لیئے وسائلِ رزق اللہ نے زمین و آسمان میں ہر جگہ پھیلا دیئے ہیں اور انسان کی خلقت میں اس کی پوری قابلیت اور صلاحیت رکھی ہے کہ وہ ان وسائلِ رزق کو حاصل کر سکے۔ اب صرف یہ بات رہ جاتی ہے کہ ان وسائل کو کس طرح حاصل کیا جائے اور پھر کس طرح کام میں لایا جائے۔ قرآن حکیم نے اس بات کو بھی پوری تشریح کے ساتھ سمجھا دیا ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ہر انسان اپنا رزق صرف ان ہی وسائل سے حاصل کرے جو اس کے لیے جائز ہوں ۔

ناجائز اور حرام طریقوں سے رزق حاصل کرنا اور وسائل رزق کو تلاش کرنا اسلام کے نزدیک ممنوع ہے اور درحقیقت حرام طریقوں سے حاصل کی ہوئی روزی انسان کا وہ حقیقی رزق ہے ہی نہیں جو اللہ نے اس کے لیئے مقرر کیا ہے ۔ ان حرام طریقوں میں اسمگلنگ ، چوری ، ملاوٹ ، ذخیرہ اندوزی یعنی احتکار فریب دہی ، جھوٹ بول کر خراب مال کو اچھا بتانا اور اسی طرح کی وہ باتیں داخل ہیں جو اللہ نے ممنوع قرار دی ہیں اور وہ شخص جو کتاب اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور جو خاتم الانبیاء حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی نبوت و رسالت پر ایمان رکھتا ہے کبھی

ان ناجائز طریقوں کے قریب بھی نہیں جا سکتا۔ مثال کے طور پر ایک حدیث میں حضورؐ نے فرمایا ہے: مَنْ غَشَّنَا فَلَیْسَ مِنَّا۔ جو شخص ہمیں کسی طرح بھی دھوکا دے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ یعنی وہ قطعاً مسلمان نہیں ہے۔

مختصر یہ کہ اللہ کا دیا ہوا رزق تو ہر جگہ موجود ہے اور انسان میں اُسے حاصل کرنے کی بھرپور صلاحیت بھی موجود ہے لیکن اسلام کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ روزی صرف حلال طریقوں سے حاصل کیجائے۔ ان تمام بنیادی مسائل کے ساتھ ہی یہ بھی ایک اہم ترین مسئلہ ہے کہ حلال روزی اور جائز رزق کے حصول کے بعد اُسے خرچ کس طرح کیا جائے یعنی کہاں اور کیونکر خرچ ہو اور کہاں خرچ نہ ہو۔ قرآن حکیم نے اس رخ کو بھی تشنہ نہیں چھوڑا ہے اور ہمیں اجازت ہے کہ ہم اللہ کے عطا کیئے ہوئے رزق کو اپنی ضرورت بھر حاصل کر سکتے ہیں پھر ساتھ ہی یہ حکم ہے کہ جو کچھ ہماری واقعی اور حقیقی ضرورت سے بچ جائے اس میں سے ہم دوسروں کے اُن حقوق کو ادا کریں جو اللہ نے مقرر کر دیئے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو واجب حقوق ہیں جیسے صَدَقہ، واجبہ وغیرہ اور کچھ وہ ہیں جو حُسنِ سلوک اور عام نیک مقاصد سے متعلق ہوں۔

اِس طرح وسائل رزق سے فائدہ اٹھانے کا حق تو انسان کو ہر وقت اور ہر صورت میں حاصل ہے مگر قرآن حکیم نے اس کی حدیں مقرر کر دی ہیں۔ جن کی پابندی کرنا ہر سچے مسلمان پر فرض ہے۔ حقیقی مؤمن اور اصلی مسلمان کی شان یہی ہے کہ قدرت کے عطا کیئے ہوئے وسائل رزق سے خود بھی جائز طور پر فائدہ اٹھائے اور دوسروں کو بھی اُن سے فائدہ حاصل کرنے میں رکاوٹ نہ بنے۔ اور اُن وسائل کے حصول اور اُن کے مصرف میں احکام خداوندی کی بھرپور پابندی کرے۔

معاشی تفاوت اور اسلام

معاشی تفاوت کو سمجھنے کے لیئے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم اسلام کے بتائے ہوئے معاشی نظام سے پوری طرح واقفیت حاصل کریں جس کے بعد ہم اسے باآسانی سمجھ لینگے کہ اس تفاوت کی نوعیت اسلام کی نظر میں کیا ہے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالےٰ نے جہاں انسان کی فلاح اور اصلاح کے لیئے ایک انتہائی مکمل روحانی اور اخلاقی نظام تعلیم دیا ہے ساتھ ہی اُس نے اُس کی کاروباری زندگی اور معاشی حیات کو اعتدال پہ رکھنے کے لیئے کچھ دستوری نظریات اور بنیادی اصول بھی مقرر کردیئے ہیں جن کی روشنی میں ہم اقتصادی بے راہ روی اور معاشی ناہمواری کے خوفناک نتائج سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ قرآنی تعلیمات کے پیش نظر معاشی نظام کی

بنیادیں تین باتوں پر قائم ہیں ۔ ایک یہ کہ سرمایہ کا اصلی مالک صرف اللہ ہے ۔ اور انسان اس کی دی ہوئی دولت اور سرمایہ کا امین ہے اس لیئے جہاں اور جس طرح اس کا حکم ہو، بحیثیت ایک امانتدار نائب کے ہمیں اسے اسی طرح صرف کرنا چاہیئے ۔ اللہ کا فرمان ہے :
وَلِلّٰہِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (آل عمران) آسمانوں اور زمین کا اصلی مالک صرف اللہ ہے ۔ پھر ظاہر ہے کہ جب زمین و آسمان کی ہر چیز صرف اللہ کی ہے تو اس کی مخلوق میں سے کسی کو بھی اس کی نعمتوں پر تصرف کرنے کا حق اس وقت تک نہ ہو گا جب تک وہ اسے اس کی اجازت نہ دے ۔ دولت جس شکل میں بھی ہو ہم اس کے اصلی مالک کس طرح ہو سکتے ہیں جب کہ وہ جن وسیلوں سے حاصل ہوتی ہے وہ سب ہی اللہ کے پیدا کیئے ہوئے ہیں ان وسیلوں میں سب سے زیادہ جس کی اہمیت ہے وہ زمین ہے یا وہ چیزیں جو اس سے نکلتی ہیں یا زمین کے ساتھ پائی جاتی ہیں ۔ ان میں سے کوئی چیز بھی ہماری پیدا کی ہوئی نہیں ہے ۔ زمین اسی نے خلق کی ۔ پانی اسی

نے دیا۔ پھل پھول، ترکاریاں، سبزیاں، لکڑی، لوہا تمام دھاتیں، بجلی، پتھر غرض وہ تمام سامان جس سے ہم دولت حاصل کرتے ہیں اللہ ہی کا پیدا کیا ہوا ہے انسان میں یہ قوت و طاقت کہاں ہے کہ وہ اس طرح کی ایک چیز بھی پیدا کر سکے۔ وہ تو ایک ذرّہ اور ایک پتی کو بھی نہیں بنا سکتا۔ وہ تو بس ان چیزوں پر محض تصرف کر سکتا ہے اور اپنی مرضی کے مطابق اپنے اختیار سے انھیں اپنے لیئے کام میں لا سکتا ہے۔ اس کے سوا اُسے مقدور ہی کیا ہے۔ پھر ان چیزوں کو اپنے کام میں لانے کے لیئے ہمارے پاس جو طاقت ہے وہ بھی اللہ ہی کی دی ہوئی ہے، عقل و فہم بھی اسی کا عطیّہ ہے، اعضاء و جوارح بھی اُسی کے دیئے ہوئے ہیں۔ خلاصہ یہ ہوا کہ دولت کمانے والے اور ان کی تمام قوتیں اور صلاحیتیں اور حصول دولت کے تمام وسیلے اللہ ہی کے پیدا کیئے ہوئے ہیں اور وہی اُن کا حقیقی اور اصلی مالک اور حاکم ہے۔ دولت جن وسیلوں سے حاصل ہوتی ہے ان میں ایک اہم چیز انسان کی محنت ہے لیکن محنت

کے بھی تمام ذرائع و وسائل اللہ ہی کے تخلیق کیئے ہوئے ہیں۔ اس طرح اسلام کے معاشی نظام کا سب سے پہلا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ ہر چیز کا اصلی مالک صرف اللہ ہے۔ انسان محض ایک امین اور نائب کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس نظام کا دوسرا بنیادی تصور یہ ہے کہ دولت کی [illegible] یعنی ذخیرہ اندوزی نہ ہونا چاہیئے۔ قرآن حکیم کی زبان میں اس ذخیرہ اندوزی کا نام "کنز" ہے سورۂ توبہ میں اللہ کا فرمان ہے جس کا ترجمہ یہ ہے:- جو لوگ سونے اور چاندی کو جوڑ جوڑ کر رکھتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں صرف نہیں کرتے (اے رسولؐ) انھیں دردناک عذاب کی خبر دیدو"۔ اس اصول کے مطابق ضروری ہے کہ دولت صرف جمع کرنے کے لیئے حاصل نہ کی جائے بلکہ اسے ہر حالت میں فرد اور معاشرہ کی بہبود و فلاح میں صرف ہوتا رہنا چاہیئے اور یہ بات بھی ضروری ہے کہ اس کا مصرف اللہ کے حکم کے مطابق ہو۔

اسلام کے نظام معاشیات کا تیسرا اصول یہ ہے کہ دولت اور سرمایہ پر چند مخصوص افراد کی اجارہ داری

نہ ہونے دی جائے۔ اسلام بنیادی طور پر اس کا شدید مخالف ہے کہ چند افراد کے پاس تو دولت کا انبار رہو اور دوسرے انسان روٹی کے ایک ایک ٹکڑے کو ترسیں۔ اللہ کی پیدا کی ہوئی زمین، اُس کی پیداوار، اُس کے دریا، پہاڑ، پھل، درخت، میوے، معدنیات کے ذخیرے یہ سب چیزیں اُس کی مخلوق کے لیئے عام ہیں اس لیئے اُس کی عطا کی ہوئی ان نعمتوں پر چند افراد کی اجارہ داری اور [illegible] نہیں ہونا چاہیئے اور انھیں یہ اختیار نہیں ہونا چاہیئے کہ وہ دوسروں کو ان نعمتوں سے محروم کر دیں اور انھیں صرف اپنا غلام بنا کر رکھیں اور ان کے خون اور پسینے سے کمائی ہوئی دولت، گھر بیٹھ کر بغیر محنت کیئے ہوئے آرام سے کھاتے رہیں اور محنت کش طبقہ اس سے اپنا جائز حق حاصل نہ کر سکے۔ سورۂ حشر میں اللہ کا ارشاد ہے: کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْکُمْ، یعنی دولت کو اس کے صحیح اور جائز مصرف میں خرچ ہونا رہنا چاہیئے تا کہ ہر پھر کر وہ صرف چند دولت مندوں ہی میں محدود ہو کر نہ رہ جائے۔ قرآنِ حکیم کے اسی ارشاد سے تعلیم

دولت اور تقسیم کار کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ بلاشبہ اگر دولت و ثروت کسی مخصوص گروہ کی ملکیت بنا دی جائے تو عوام کی قوتِ عمل اور کارکردگی کی صلاحیت فنا ہو جائے گی اور پھر کوئی ملک اور کوئی معاشرہ ترقی نہ کر سکے گا۔ اور اگر اس کی تقسیم عادلانہ طریقہ پر کی جائے گی تو سب کے سب خوشحال ہو جائیں گے اور اُن کی قوتِ عمل میں کمزوری کے بجائے ترقی ہو گی۔ یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ اگر کسی شخص کو اس کا یقین ہو جائے کہ وہ خواہ کتنی ہی محنت کرے، اسکی آمدنی میں اضافہ نہ ہو گا تو فطری طور پر اس کی قوتِ کارکردگی اور جذبۂ عمل میں کمزوری پیدا ہونا چاہیئے۔ اس طرح چند سرمایہ داروں کی زندگی درحقیقت لاتعداد عوام کی موت کا نام ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی ناانصافی اور ایسے غیر معتدل نظام میں انسان اپنی اجتماعی و انفرادی زندگی کو کبھی کامیاب اور پُر سکون نہیں بنا سکتا۔ اس بنا پر اسلامی نقطۂ نظر سے یہ بات ہر حالت میں ضروری ہے کہ وسائلِ دولت پر کسی خاص گروہ کا تنہا قبضہ نہ رہے بلکہ پورے انسانی معاشرہ کو اس سے نفع حاصل کرنے کا

موقع اور حق دیا جائے۔ معاشی مسائل کا گہرا تعلق انسان کی عام کاروباری زندگی سے ہوا کرتا ہے اور اسی لیئے ہر زمانہ میں معاشیات کو انسان کی اجتماعی زندگی میں بڑی اہمیت حاصل رہی ہے لیکن موجودہ سائنسی دور میں ان مسائل کی اہمیت پہلے سے بہت زیادہ بڑھ گئی ہے۔ غرض انسان کی انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی ہمیں اسلام نے جو اصول بتایا ہے وہ صرف یہ ہے کہ وسائل دولت کا حقیقی مالک اللہ ہے اور اُسی کے حکم اور اسی کی مرضی کے مطابق ہمیں ان وسائل کو کام میں لانا چاہیئے اور ان کے ذریعہ سے کمائی ہوئی دولت کو بھی اسی طرح خرچ کرنا چاہیئے جس طرح ہمیں اللہ نے بتایا ہے۔ اگر ہم ایسا کریں گے تو یقیناً اس قسم کا کوئی معاشی تفاوت معاشرہ میں پیدا نہیں ہوسکتا جس کی بنیاد حق تلفی، استحصال اور ناانصافی پر ہو۔ دوسرے لفظوں میں جب ہم اپنے سرمایہ کو اللہ کی امانت اور اپنے آپ کو اس کا امین سمجھیں گے تو اس کی تقسیم اور اسکے خرچ کرنے میں بھی کبھی کوئی غیر معتدل اور غلط راستہ اختیار نہ کرینگے

اور اس طرح معاشرہ ہر قسم کی بد دیانتی، خیانت، رشوت ستانی، سود خوری، چور بازاری، ذخیرہ اندوزی، ملاوٹ، دھوکا، چوری، استحصال کی لعنتوں سے محفوظ ہو جائیگا۔

اللہ نے سورۂ نساء ۲۹ میں صاف طور پر فرما دیا ہے۔ لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ "اپنے مال آپس میں حرام طریقہ پر نہ کھاؤ"۔ یہ ایک ایسا بنیادی نظریہ ہے جس کا تعلق فرد سے اسی طرح ہے جیسے خود معاشرہ سے ہے۔

انسانی معاشیات کے صرف دو ہی پہلو ہو سکتے ہیں آمدنی کا حصول کیونکر ہو اور اسے کیونکر خرچ کیا جائے اگر ہم ان دونوں پہلوؤں میں اسلام کے بتائے ہوئے عادلانہ نظام کے پابند ہو جائیں تو ہمارے معاشی استحکام میں کبھی کوئی خلل نہیں پڑ سکتا۔

اسلام نے یہ بتا کر کہ ہر چیز کا اصلی مالک صرف اللہ ہے اور انسان اس کا امین ہے، انسانی حرص و ہوس اور ظلم و جور کے تمام راستے بند کر دیئے ہیں پھر اس کے بعد کوئی سچا مسلمان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ وہ کسی دوسرے کے حق کو مارنے کی جرأت کرے یا خود ناجائز طور پر

اپنے حق اور اپنے حصّہ سے زیادہ حاصل کرنے کی کوشش
کرے۔

حضرت امیر المومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے ایک موقع پہ فرمایا تھا کہ اگر مجھ سے کہا جائے کہ میں ایک چیونٹی کے مُنہ سے اس کے دانے کو چھین لوں اور اس کے انعام میں مجھے ساری دنیا کے خزانے دے دیئے جائیں گے تو میں اس لالچ میں اُس چیونٹی کا رزق اُس کے مُنہ سے چھیننے کی جرأت نہیں کر سکتا - درحقیقت یہ سبق اسی معاشی نظام عدل کا ہے جس کی اللہ نے ہمیں اپنی کتاب اور اپنے نبیؐ کے ذریعہ سے تعلیم دی ہے - اگر ہم اسلام کے بنائے ہوئے معاشی نظام کو اپنا لیں تو یقیناً ہم اُس ظالمانہ معاشی تفاوت کی لعنت سے بچ سکتے ہیں جو تمام انفرادی اور اجتماعی بُرائیوں اور انسانی معاشرہ کے امن و سکون کی تباہی و بربادی کا سب سے بڑا سبب ہے۔

حُبِّ رسولؐ

حُبِّ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے موضوع پر کچھ کہنے سے پہلے ہمیں اس لفظ کے معنی اور مفہوم کو بھی سمجھ لینے کی ضرورت ہے تاکہ ہم اس بات کو سمجھ سکیں کہ حُب اور محبت کس چیز کا نام ہے اور وہ کس طرح پیدا ہوتی ہے پھر یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ اگر اپنے صحیح مفہوم کے لحاظ سے کبھی محبّت پیدا ہو جائے تو اس کے نتائج اور اثرات کیا ہو سکتے ہیں۔

اہلِ معرفت نے محبت کے مفہوم کو طرح طرح سے بیان کیا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ محبت ایک آگ ہے جو دل کے اندر تصوّرِ محبوب کے علاوہ ہر تصوّر کو جلا دیتی ہے۔ کسی نے اس طرح کہا ہے کہ محبّت دل کے کسی چیز کی طرف بھرپور جھکاؤ کا نام ہے۔ کسی کے نزدیک محبت ایک ایسی دلی رغبت کا نام ہے جسے نہ تو بُرا برتاؤ کم کر سکے اور نہ اس میں اچھے

طرزِ عمل سے اضافہ ہو سکے۔ اسی طرح نہ نزدیکی اور قرب اس کو بڑھا سکے اور نہ دوری اسے گھٹا سکے۔ غرض مختلف لفظوں میں اور الگ الگ طریقوں سے علماءِ نفسیات نے محبّت کے معنیٰ بیان کیئے ہیں مگر اس کا حاصل اس بات کے سوا کچھ نہیں ہے کہ یہ رغبت اور یہ رشتۂ محبت کسی کے دل میں اُسی وقت وجود میں آتا ہے جب اس کو محبوب کی ذات میں کسی پسندیدہ صفت، خوبی یا کمال کا احساس ہوتا ہے اس بنا پر محبت و الفت کے لیئے یہ بات ضروری ہے کہ محبوب میں کوئی خوبی یا خصوصیت پائی جائے اور اسی خوبی اور اسی صفت کے احساس کا نام محبّت ہے پھر اس کے بعد اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو مرضی اور خواہش محبوب کی ہوتی ہے اگر سچی محبت ہے تو کبھی اس کا حبیب اور دوست اس سے انحراف نہیں کر سکے گا۔ سچی محبت کے لیئے محبوب کے منشا اور خواہش و حکم پر عمل کرنا حبیب کے لیئے ہر صورت میں لازمی اور ضروری ہوتا ہے ورنہ وہ محبت نہ ہوگی بلکہ خود غرضی اور فریب ہوگا۔ اسی لیئے قرآنِ حکیم کی سورۂ آل عمران میں اللہ نے فرمایا ہے: قُل

اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ط - اے رسولؐ لوگوں سے کہدو کہ اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو تاکہ اللہ بھی تمہیں دوست رکھے اور تمہارے گناہ بخش دے ۔

اس کا مطلب یہی ہوا کہ محبت کے لئے محبوب کے حکم اور مرضی پر چلنے کی شرط ہر حال میں ضروری ہے ورنہ ایسا شخص کسی طرح بھی دوست نہیں کہا جا سکتا جس کا عمل تو محبوب کی مرضی اور حکم کے خلاف ہو اور صرف زبان سے وہ اس کی محبت کا دعویٰ کرے ۔ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بہت سی حدیثوں میں اسی بات کی طرف صاف ارشارہ موجود ہے ۔ ایک حدیث میں جو بحار الانوار میں ہے حضورؐ نے فرمایا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے : اس اللہ کی قسم جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے کوئی شخص بھی پورا مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ مجھے اپنی ذات سے ، اپنے ماں باپ سے ، اپنے گھر والوں سے ، اپنی اولاد سے اور دوسرے عام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ رکھتا ہو" ۔ اس کا مطلب صرف یہ ہوا کہ مکمل ایمان بغیر محبت رسولؐ حاصل نہیں ہو سکتا اور یہ

ممکن ہی نہیں ہے جب تک حضورؐ کی ذات اور آپ کے حکم کو ہر شخص کی ذات اور اس کے حکم پر ترجیح نہ دی جائے اور اسی بات پر عمل کیا جائے جس کا آپ حکم دیں۔ بخاری بابُ الایمان میں بھی تقریباً ان ہی لفظوں میں حبّ رسولؐ کی تعلیم دی گئی ہے۔ ایک حدیث میں حضورؐ فرماتے ہیں: "لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَّالِدِہٖ وَوَلَدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ"۔ یعنی کوئی شخص بھی مجھ پر پوری طرح ایمان نہیں لا سکتا جب تک وہ مجھے اپنے والد، اپنی اولاد اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ رکھے"۔ اسی محبت اور پیروی کی طرف سورۂ احزاب میں بھی کھلا ہوا اشارہ موجود ہے۔ اللہ کا ارشاد ہے: اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِھِمْ" یعنی نبی تو تمام اہل ایمان پر ان کی اپنی جانوں سے بھی زیادہ حق رکھتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہوا کہ ایمان کامل بغیر محبت رسولؐ حاصل نہیں ہو سکتا اور یہ محبت بغیر حضورؐ کی پیروی اور بغیر آپ کے اتباع کے ممکن نہیں ہے اس لیئے سچا محبِ رسولؐ وہی ہے جو حضورؐ کے احکام و ہدایات پر عمل بھی کرے۔

احترامِ قرآن

دنیا میں انسان کی ہدایت کے لیے اللہ نے جب بھی پیغمبروں کو بھیجا تو انھیں ایسے معجزات بھی عطا کیے جنہیں دیکھ کر لوگ اُن کی سچائی کا یقین کر سکیں اور اُن پر ایمان لائیں۔ گذشتہ انبیاء کے ساتھ اُن کے معجزے بھی چلے گئے مگر قرآنِ حکیم ایک ایسا معجزہ ہے جو قیامت تک باقی رہے گا اور جس طرح سرورِ کائنات کی رسالت کبھی ختم نہ ہوگی آپ کا یہ معجزہ بھی باقی رہے گا۔ اس کی عظمت و بلندی کا صحیح اندازہ سورۂ اسراء میں اللہ کے اس ارشاد سے ہو سکتا ہے۔ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِیْرًا۔ یعنی اگر تمام انسان اور جنات مل کر بھی یہ چاہیں کہ وہ اس قرآن کا مثل لے آئیں تو نہیں لا سکتے

اگرچہ اس کوشش میں ایک دوسرے کا مددگار
بن جائے اسی طرح سورۂ بقرہ میں[۲۳، ۲۴] فرمایا گیا ہے جس
کا ترجمہ یہ ہے : اگر تم کو اس کلام میں جو ہم نے اپنے
بندہ پہ نازل کیا ہے کچھ شک ہے تو پھر تم بھی ایسا
ہی کوئی ایک سورہ بنا لاؤ اور خدا کے مقابلہ میں جو
تمہارے مددگار ہوں انھیں بھی بلالو، اگر تم سچے ہو
لیکن اگر تم یہ نہیں کر سکتے اور کبھی ہرگز ایسا نہ کر سکو
گے تو اُس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن آدمی اور
پتھر ہیں جو کافروں کے لیئے تیار کی گئی ہے" - جہاں
تک قرآن حکیم کے احترام کا تعلق ہے یہ بات بالکل
ظاہر ہے کہ اللہ کا کلام ہونے کی وجہ سے ہر کلام سے
زیادہ قابل عزت و احترام ہے پھر یہ صرف اُس کا
کلام ہی نہیں ہے بلکہ اِس میں اُس نے نوع انسان
کی ہدایت و رہنمائی کا پورا سامان رکھ دیا ہے اور اس
کے ذریعہ سے ایک ایسے نظام زندگی کی ہم کو تعلیم
دی ہے جس میں ہماری دنیوی اور اخروی ہر قسم کی
فلاح و بہبود بتائی جاتی ہے - یہی نظام زندگی ہے

جس کے اصول و ضوابط پر عمل کر کے ہم صحیح معنی میں انسان بن سکتے ہیں۔

قرآن حکیم اپنی لفظی ترتیب اور ساخت کے لحاظ سے بھی معجزہ ہے یعنی قیامت تک آنے والی انسانی نسلیں خواہ وہ کوئی بھی زبان بولتی ہوں اپنی اپنی زبان میں کوئی ایسا کلام نہیں پیش کر سکتیں جو قرآنِ پاک کی طرح لفظی اور معنوی دونوں حیثیتوں سے معجزہ بننے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ یہ ایک ظاہر بات ہے کہ نظم میں جو اثر اور کشش ہوتی ہے وہ نثر میں نہیں ہوا کرتی اس طرح قرآن کریم کا جلیل مقام اس چیز سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اگرچہ شعر اور نظم کی صورت میں نہیں ہے بلکہ عبارت اور نثر کی صورت میں ہے مگر اس کے سامنے عرب ادیبوں کی تمام ادبی اور شعری کوششیں بے حقیقت بن کر رہ گئیں اور آج تک جبکہ اس قرآنی للکار کو چودہ سو سال ہو رہے ہیں کوئی شخص بھی اس کا مقابل لانے کی کوشش میں کامیاب نہ ہو سکا اور اس وقت تک دنیا کی متمدن ترین اور انتہائی

تہذیب و ترقی یافتہ قوموں کے کتب خانے اس کتاب الٰہی کے مثل سے خالی ہیں۔

بلاشبہ قرآن کریم کی ایک ایک آیت میں اللہ نے ایسے علوم و معارف بھر دیئے ہیں اور ایسے اصول و ضوابط کی تعلیم دی ہے جن پر انسان کی بہبود و فلاح و نجات کا انحصار ہے۔ یوں تو اس کا پڑھنا، لکھنا، سننا اور سمجھنا سب ہی عبادت ہے مگر اس کی اصلی غرض یہی ہے کہ اسے خوب سمجھ کر پڑھا جائے اور اس کا احترام بھی اسی وقت پورا ہو سکتا ہے جب کہ اس کو پڑھ کر سمجھا بھی جائے۔ سورۂ صٓ میں [۲۹] اللہ نے اسی بات کی طرف اشارہ فرمایا ہے، اِن لفظوں میں: کِتَابٌ اَنْزَلْنَاہُ اِلَیْکَ مُبَارَکٌ لِّیَدَّبَّرُوْٓا اٰیٰتِہٖ وَلِیَتَذَکَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ۔" اے رسولؐ ہم نے ایسی کتاب کو تم پر نازل کیا ہے جو بڑی برکت والی ہے تاکہ لوگ اس کی آیتوں پر غور کریں اور اس لیئے کہ عقل والے اس سے نصیحت حاصل کریں"۔ اس بنا پر قرآن پاک

کا مکمل احترام یہی ہوگا کہ ہم اس کو پوری طرح سمجھنے
اور اس کے ہدایات پر عمل کرنے کی بھی کوشش کریں۔

کتاب وحکمت

بعثتِ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بنیادی اور مخصوص غرض کتاب وحکمت ہی کی تعلیم تھی تاکہ آپ دنیا میں تشریف لاکر دنیا والوں کو ان دونوں چیزوں سے روشناس کردیں۔ سورۂ بقرہ اور سورۂ آلِ عمران نیز النساء، المائدہ اور سورۂ جمعہ میں بار بار اسی کتاب وحکمت کی تعلیم کا ذکر کیا گیا ہے اور اسی کو بعثتِ رسولؐ کی بنیادی غرض بتایا گیا ہے۔ سب سے پہلے اس کا ذکر سورۂ بقرہ کے پندرھویں رکوع میں ہے جہاں تعمیر و تجدیدِ کعبۂ مکرمہ کے تذکرہ میں دعائے حضرت ابراہیمؑ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے تو اس دعا کے آخر میں یہ ارشاد ہوا ہے: رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِكَ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَیُزَكِّیْهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ۔ حضرت ابراہیمؑ خلیل اللہ اور حضرت اسمٰعیلؑ نے

ملکر یہ دعا مانگی تھی کہ اے ہمارے پروردگار ہماری ذرّیت مُسلمہ ہی میں سے اُن میں ایک ایسا رسول مبعوث فرما جو انھیں تیری آیتیں پڑھ کر سنائے اور انھیں کتابِ الٰہی اور عقل و دانائی کی تعلیم دے اور اُن کے کردار کی تطہیر کرے یقیناً تو بڑا زبردست اور بڑا حکمت والا ہے" درحقیقت کتاب و حکمت کی تمامتر تعلیم کی اصلی غرض یہی ہے کہ اس کے ذریعہ سے انسانی ذہن و ضمیر اور افکار و عقائد کے ساتھ ساتھ اس کے اعمال و افعال کی تطہیر کی جائے اور اسی وجہ سے "تزکیۂ نفس" پر ہر جگہ زور دیا گیا ہے۔ اس ارشادِ ربّانی سے ہمارے سامنے یہ حقیقت روشن ہو گئی کہ نبی کا پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ آیاتِ الٰہی کی دنیا والوں کے سامنے تلاوت کرے اور اُن کو احکام و ہدایاتِ ربّانی سنا دے جو اللہ نے اپنے بندوں کے لیئے مقرر کیئے ہیں پھر دوسرا کام یہ ہوتا ہے کہ وہ اُن آیات اور اُس کتابِ الٰہی کی تعلیم دے اور اس کی تشریح و تفسیر بھی کرے تاکہ لوگ اس کے مطلب کو اچھی طرح سمجھ سکیں اور پھر وہ دانائی اور حکمت و عقل کی بھی تعلیم دیتا ہے تاکہ

سُننے والوں کی سمجھ اور فہم میں اتنی بلندی پیدا ہو جائے اور اس کی سطح اس قدر اونچی ہو سکے کہ وہ اِن آیاتِ الٰہی کو سمجھنے کے قابل بن سکیں اور اس طرح اس بات کے لائق بھی ہو سکیں کہ ان احکام و ہدایات پر عمل کریں اور اپنے کردار کی تطہیر کر سکیں اس طرح رسالت کے فرائض میں کئی باتیں شامل ہیں ایک تبلیغ دوسرے تعلیم تیسرے تزکیۂ نفس۔ یہ تینوں باتیں اس امر پر موقوف ہیں کہ تعلیم حکمت کے فرض کی تکمیل پہلے کی جائے کیونکہ مخاطب میں اگر غور کرنے اور سمجھنے کی صلاحیت موجود نہ ہوگی تو اس کو تعلیم دینا لاحاصل ہو جائے گا۔ اس لیئے یہ بات ضروری ہے کہ پہلے مخاطبوں کی سمجھ کی سطح کو اونچا کیا جائے تاکہ وہ اُن باتوں کو سمجھنے کے قابل بن سکیں جو اُن سے کہی جائیں۔ اگر زمین کو نرم نہ بنایا جائے اور اس میں کاشت کرنے سے قبل وہ کام نہ کیئے جائیں جن کی وجہ سے اُس میں اناج پیدا کرنے کی صلاحیت وجود میں آتی ہے تو اس میں دانے ڈالنا اور پیدوار کی امید رکھنا لاحاصل ہوگا بس اسی طرح اگر انسانی ذہن صلاحیت سے خالی ہوگا تو اس کی تعلیم

سے کچھ بھی حاصل نہ ہو گا۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے اس لفظ "حکمت" سے اور یہ بتایا گیا ہے کہ نبی کا کام محض یہی نہیں ہوتا کہ وہ کچھ آیتیں تلاوت کر دے اور کوئی الہٰی کتاب لوگوں کے سامنے پیش کر دے بلکہ اس کا پہلا بنیادی کام یہ ہوتا ہے کہ وہ انسانی ضمیر کو بیدار کرے، اس کی ذہنی قوتوں کو اجاگر کرے اور خالقِ عالم نے اپنی قدرت کاملہ سے انسان کو جو ذہنی صلاحیتیں عطا فرمائی ہیں انھیں ابھار کر بروئے کار لائے تاکہ نبی جو ہدایت لایا ہے اسے وہ سمجھنے کے قابل بن سکیں اور پھر وہ انھیں اسی معیار کے مطابق سمجھائے بھی جو انھیں عقل وفہم میں حاصل ہو سکا ہے۔ یعنی جس قدر مخاطب کی سمجھ کے معیار میں بلندی پیدا ہو اسی کے لحاظ سے نبوّت و رسالت کے لہجہ میں بھی تبدیلی پیدا ہو ورنہ اگر صلاحیت اور سمجھ کا معیار مناسب نہ ہو گا تو نتیجہ میں نہ صرف تبلیغ اپنے مقصد میں ناکام رہے گی بلکہ اندیشہ یہ ہے کہ ہدایت کے بجائے گمراہی کے پہلوؤں کو ابھرنے کا موقع مل سکے گا اسی لیے حدیث میں فرمایا گیا ہے "کلّموا النّاس علیٰ قدر عقولھم"، ہمیشہ لوگوں کی سمجھ اور عقل

کی سطح کے مطابق گفتگو کیا کرو تا کہ اس گفتگو کا خاطر خواہ نتیجہ پیدا ہو سکے ورنہ یہ پوری طرح ممکن ہے کہ نا سمجھ لوگ اس بلند سطح کی گفتگو سے اپنی عقل کی کمزوری اور اپنی ناسمجھی کی وجہ سے کوئی غلط راستہ اختیار کر لیں۔
غرض فرائض رسالت میں ایک اہم فریضہ یہ بھی ہے کہ اللہ کا نمائندہ بنی نوع انسان کی قوتِ فکر کو ابھارے اسی لیئے قرآن حکیم میں جابجا تفکرّ و تعقل پر زور دیا گیا ہے۔ اور انسان کو یہ ہدایت کی گئی ہے کہ وہ کائنات کی چیزوں پر غور و فکر کرتا رہے۔ کبھی آسمانوں کی خلقت پر غور کرے، کبھی ستاروں کی تخلیق پر غور کرے، کبھی شمس و قمر کے طلوع و غروب کے نظم و ترتیب کو دیکھے کبھی بحر و بر پر نظر ڈالے، کبھی پھولوں اور پتیوں کی صنعت کا جائزہ لے، سمندروں اور کشتیوں کو دیکھے اور باہر کی کائنات کے ساتھ ہی خود اپنے جسم و روح کی پیدائش پر بھی نظر ڈالے۔ مختصر یہ کہ قرآن حکیم نے قدم قدم پر حکمت کے درس دیئے ہیں، آفاق و انفس کی سیرِ عقلی و فکری کی طرف دعوت دی ہے یہ سب اسی لیئے ہے تاکہ

انسان کے ذہن وفکر میں کتاب الٰہی اور پیغامِ خداوندی کے سمجھنے کی صلاحیت و طاقت پیدا ہو جائے اور اُس معرفت کے حصول کی صلاحیت آجائے جو انسان کی فلاح و نجاتِ دنیوی و اُخروی کی واحد ضمانت ہے تو اب اس گفتگو کا نتیجہ یہ نکلا کہ بعثت رسول کی غرض بنی نوع انسان کی فلاح ہے اور اس عظیم مقصد کے حصول کے لیے تین بنیادیں ہیں۔ پہلی بنیاد یہ ہے کہ انسان کی فکری سطح بلند کی جائے اور اس کی تعقل و تفکر کی قوتوں کو ابھارا جائے اور اس کی تمام عقلی صلاحیتوں کو بروئے کار لایا جائے اور دوسری بنیاد یہ ہے کہ اُس کے فکری معیار کے مطابق اُسے آیاتِ الٰہی سے روشناس کرایا جائے اور پھر تیسری بنیادِ فلاح یہ ہے کہ اُسے منشاء الٰہی اور نظام خداوندی سے آگاہ کیا جائے یعنی اس کتاب کی اسے تعلیم دی جائے جو احکام الٰہی کا مجموعہ ہے اور جب وہ ان احکام ادران ہدایتوں کی عظمت سے آگاہی حاصل کرے اور انھیں اچھی طرح سمجھ لے تو پھر اسے تطہیر نفس اور تزکیۂ ضمیر و کردار کی دعوت

دی جائے جو آخری اور واحد نتیجہ ہے تلاوتِ آیات اور تعلیم کتاب وحکمت کا۔ اس طرح نبی کی حیثیت ایک مبلغ کی بھی ہوتی ہے، ایک معلّم کی بھی ہوتی ہے اور ایک ہادی اور رہنما کی بھی ہوتی ہے اور ان سب باتوں کے علاوہ اس کی حیثیت ایک نمونہ اور مثال کی بھی ہوتی ہے کیونکہ نظری اور فکری تعلیم میں اس وقت تک پورا کمال پیدا نہیں ہوسکتا جب تک نظریہ کو عملی شکل دیکر ایک نمونہ اور مثال کی صورت میں نہ پیش کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ انسانی تاریخ میں نظریات کی زندگی کو دوام نہ مل سکا۔ نظریات ہر دور میں ابھرتے رہے اور مٹتے رہے اور انسانی نسل اُن سے اپنی مادّی اور عملی زندگی اور اس کے مسائل میں خاطر خواہ فائدہ نہ اٹھا سکی مگر جب یہی اعلیٰ مگر خشک نظریات عملی نمونوں میں ظاہر ہوئے تو اُن سے انسان کو اپنی عملی زندگی میں ہر ہر قدم پر مدد ملی اور وہ اپنی صلاحیت وقابلیت کے مطابق اُن سے استفادہ کرتا رہا۔ انبیاءؑ مرسلینؑ کا مشن یہی تھا کہ وہ صرف تعلیم کتاب پر اکتفا نہ کریں بلکہ اس تعلیم کو تزکیہ نفس کے رشتوں سے وابستہ

کردیں اور ساتھ ہی خود بھی اس تعلیم، ان نظریات اور اس تزکیۂ ضمیر و کردار کے اصول کا اپنی زندگی اور عمل سے ایک ایسا نمونہ اور مثال پیش کردیں جو مافوق البشر نہ ہو بلکہ بشری حدود کے اندر رہو تاکہ انسانی نسلیں اپنے ہر دور میں اُن کی پاک سیرت کو اپنے لیئے مشعل راہ اور منارۂ رشد و ہدایت بنا سکیں۔

اتحاد و تنظیم

کسی معاشرہ کی زندگی، ترقی اور ہر قسم کی فلاح و بہبود صرف اسی بات پر موقوف ہے کہ اس کے افراد پورے اتحاد و اتفاق کے ساتھ زندگی بسر کریں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جماعت اور قوم کا باہمی اتفاق و اتحاد ہی درحقیقت اس کی زندگی ہے اور اس کا انتشار اور افرا تفری اس کی موت ہے۔ پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی بعثت کے وقت عربوں میں جو فساد اور آپس کی نا اتفاقیاں جھگڑے اور لاقانونیت پھیلی ہوئی تھی وہ کون نہیں جانتا۔ ان کے بہت ہی معمولی جھگڑے بڑی بڑی لڑائیوں کی شکل اختیار کر کے سارے ملک کے لئے ایک آفت اور عذاب بن جاتے تھے اور بکریوں، بھیڑوں، اونٹوں اور زمین یا چھوٹے چھوٹے ازدواجی مسائل میں ذرا ذرا سے اختلافات قوم کی پوری زندگی کو جہنم بنا دیا کرتے تھے۔ ذاتی اقتدار، لالچ فرقہ وارانہ ذہنیت، طرح طرح کا تعصب، غرور اور تکبر، غرض

ان تمام اخلاقی برائیوں نے اُن کے لیئے اتحاد اور باہمی تنظیم کا کوئی تصوّر باقی نہ رکھا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں جب آپس کا اتحاد نہ ہو، تنظیم باقی نہ رہے تو کوئی جماعت اور کوئی معاشرہ کبھی زندگی اور اُسکی بلندیوں کا تصوّر بھی نہیں کر سکتا، جب ہر آدمی کو ہر طرف سے خطرے گھیرے ہوئے ہوں اور اُسے ہر لمحہ اور ہر وقت بے چینی، گھبراہٹ اور خوف کا سامنا ہو تو پھر وہ کس طرح زندگی کی بلند قدروں کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکتا ہے۔ وہ شاخ جو ہوا کے جھکڑوں اور طوفان کے تھپیڑوں سے کانپ رہی ہو اس پر آشیانہ نہیں بنایا جا سکتا۔ بس یہی حالت انسانی زندگی کی بھی ہے۔ جب تک باہمی اتحاد اور تنظیم نہ ہو، ایک فرد کے دل میں اپنے دوسرے قومی بھائی کے دکھ درد کا احساس نہ ہو، ذاتی فائدے کو جماعتی اور قومی مفاد پر قربان کرنے کا جذبہ نہ پایا جاتا ہو اس وقت تک انسان زندگی کی ساری بلندیوں اور کامیابیوں سے محروم رہے گا۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کی بعثت کا زمانہ وہ تھا جب دنیا لا قانونیت اور بد نظمی کی آگ میں جل رہی تھی اور ہر طرف افراتفری اور انتشار کا دَور دَورہ تھا۔ آپ نے خاندانی رشتوں

اور دوسرے تمام رشتوں سے زیادہ مضبوط اور اونچا رشتہ لوگوں کو بتایا جس نے اس وقت کی مغرور اور سرکش عرب قوم کی سرے سے ذہنیت ہی بدل دی۔ یہ رشتہ دین کا تھا، یہ رشتہ حق اور دیانت کا تھا، یہ رشتہ سچائی اور خداپرستی کا تھا اور یہ اسلام اور ایمان کا رشتہ تھا جس سے وہ لوگ جو نسلی اور خاندانی تفریق اور امتیاز کا شکار بنکر آپس میں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو چکے تھے، باہم مل بیٹھے اور سارے جھگڑے بھول کر آپس میں بھائی بھائی بن گئے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے خاندانی اور قبائلی جھگڑوں کو مٹا کر سب کو دین، اخوّت اور محبت کے رشتہ میں جکڑ دیا تھا۔ یہ اسلامی برادری ہی کا رشتہ وہ تھا جس میں دنیا و آخرت کی تمام بھلائیاں اور ہر طرح کی فلاح اور کامیابی، ترقی اور نجات کے راز پوشیدہ تھے۔ اس دینی رشتہ نے سارے مسلمانوں کے دلوں میں آپس کی محبّت، میل جول، اتحاد و اتفاق جماعتی برتری اور قومی و ملّی تنظیم کی ایک نئی روح پھونک دی ان کی آپس کی عداوتوں کو مٹا دیا اور جو لوگ مکّہ سے ہجرت کر کے مدینہ میں بس گئے تھے ان میں اور مدینہ کے مقامی مسلمانوں کے درمیان دینی اور مذہبی رشتہ کی برکت سے ایسی محبّت اور

یگانگت پیدا ہوگئی کہ وہ اپنے خاندانی، نسلی اور خون کے رشتوں کو بھی اس نئے رشتہ پر قربان کرنے لگے۔ آپس کی پرانی دشمنیاں ہمیشہ کے لیئے فنا ہوگئیں اور جو لوگ ایک دوسرے کو بدترین دشمن اور قاتل کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے وہ سگے بھائیوں کی طرح ایک دوسرے پر فدا ہونے لگے۔ اللہ کے مقدس رسولؐ نے لوگوں کو اُس کا یہ پیغام سنایا تھا:

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَیْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا ج

(سورۂ آلِ عمران آیہ ۱۰۳)

اے ایمان والو! خدا سے ڈرو اُس طرح جیسا کہ اُس سے ڈرنے کا حق ہے اور تمہیں موت نہ آئے مگر ایسی ہی حالت میں کہ تم سچے مسلمان ہو اور (دیکھو) تم سب کے سب مل کر الٰہی رشتہ کو مضبوط تھام لو اور آپس میں ٹکڑے ٹکڑے نہ ہو جاؤ اور تم اپنے اوپر اللہ کے احسان کو یاد کرو کہ تم آپس میں ایک دوسرے کے دشمن تھے (اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے) (یہ اللہ کی ذات ہے) جس نے تمہارے دلوں کو

آپس میں جوڑ دیا پھر تو تم سب (آپس میں) بھائی بھائی بن گئے ۔ اسلامی تعلیم اور اسلامی تہذیب کی بنیاد جس قانون خداوندی پر ہے اس کا سب سے بڑا تقاضا یہ ہے کہ اس نعمتِ اتحاد سے فائدہ اٹھایا جائے جس کی طرف ہم کو توجہ دلائی گئی ہے اور اسلام نے جس کا ہمیں حکم عطا کیا ہے کیونکہ یہی ایسا اکیلا رشتہ ہے جس میں ہماری ذاتی اور انفرادی، قومی اور اجتماعی دینی اور دنیوی ہر طرح کی فلاح موجود ہے اور یہی ہماری سربلندی اور عزت وعظمت ہے ۔ اس کے برخلاف افراتفری اور بدنظمی اور انتشار ہماری موت ہے اگر ہم خلفشار کا شکار ہو گئے، اگر ہماری صفوں میں ابتری اور لاقانونیت پھیل گئی تو ہمیں اس کا یقین رکھنا چاہیئے کہ ہم اپنی اندرونی اور بیرونی آزادی کی نعمت سے محروم ہو جائیں گے اور اسلام اور مسلمانوں کے پرانے دشمن جو ہمیں تباہ و برباد کرنے کی ہر وقت تاک میں رہا کرتے ہیں وہ اپنی ترکیبوں میں اور اپنی سازشوں میں کامیاب ہو جائیں گے ۔ قرآن کریم نے ہم کو بار بار تنبیہ کی ہے اور بار بار ہمیں اس خطرہ سے آگاہ کر دیا ہے ۔ ہمیں چاہیئے کہ ہم اپنی زندگی کے لیئے تباہی کو دعوت نہ دیں اور اپنے اسلامی اتحاد کو کسی ناعاقبت اندیشی

کا شکار نہ ہونے دیں۔ سورۂ انفال ۴۶ میں اللہ کا ارشاد ہے: وَاَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَرَسُوۡلَہٗ وَلَا تَنَازَعُوۡا فَتَفۡشَلُوۡا وَتَذۡہَبَ رِیۡحُکُمۡ۔ "اللہ اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت کرو، اور آپس میں جھگڑے نہ کرو (یعنی بھرپور اتفاق واتحاد اور نظم وضبط کے ساتھ زندگی بسر کرو) کیونکہ اگر تم آپس میں متحد نہ رہو گے تو ہمت ہار جاؤ گے اور تمہاری ہوا اُکھڑ جائے گی، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا ارشادِ گرامی ہے کہ سارے مسلمان آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ محبت کرنے میں ایک جسم اور ایک بدن کی حیثیت رکھتے ہیں یعنی اگر بدن کے ایک عضو کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو پورا بدن اس تکلیف کا احساس کرنے لگتا ہے بس اسی طرح اسلامی معاشرہ بھی ایک جسم ہے اور سارے مسلمان اس کے اعضا ہیں اور سچا مسلمان وہی ہے جس کے دل میں اپنے دوسرے بھائی کے دکھ درد کا پورا احساس ہو اور اس کے دکھ کو دور کرنے اور اس کو آرام دینے کی اُسی طرح کوشش کرے جیسے وہ خود اپنے دکھ کو دور کرنے اور اپنے آپ کو آرام دینے کی کوشش کرتا ہے۔ پھر آپ نے ایک دوسرے موقع پر اپنے ایک ہاتھ کی انگلیوں کو دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں ڈال کر دکھایا اور ارشاد فرمایا کہ۔ دیکھو ایک ہاتھ کی انگلیاں

جب دوسرے ہاتھ کی انگلیوں کے ساتھ مل گئیں تو ان میں کیسی قوت پیدا ہو گئی جو اس اتحاد کے پہلے کبھی ہرگز نہ تھی بس اسی طرح تمہیں آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ اتحاد واتفاق سے زندگی بسر کرنا چاہیئے تا کہ تمہاری انفرادی اور اجتماعی زندگی اور تمہاری قومی اور ملی سربلندی استحکام، سالمیت اور عزت ووقار تمہارے دشمنوں کے لیئے ناقابل تسخیر بن جائے۔

رمضان اور نزولِ قرآن

سورۂ بقرہ کے تیئیسویں (۲۳) رکوع میں اللہ کا ارشاد ہے: "شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ"۔ رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں قرآن حکیم اتارا گیا جو لوگوں کے لیے ہدایت ہے اور اس میں روشن دلیلیں ہیں ہدایت کی اور حق کو باطل سے الگ کرنے کی۔ اس طرح ماہ رمضان چند بنیادی خصوصیتوں میں سے ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس میں قرآن حکیم کا نزول ہوا اور عالم انسانیت کو ایک ایسا ضابطہ حیات اور دستور زندگی عطا ہوا جو ابد قیامت تک کیلئے نسل البشر کی ہدایت کا ضامن ہے بشرطیکہ اس ضابطۂ حیات پر پورے شرائط کے ساتھ عمل بھی کیا جائے۔ مفسروں نے بتایا ہے کہ ماہ رمضان کی شب قدر میں نزولِ قرآن

ہوا اور اس نزول کا مطلب یہ ہے کہ لوح محفوظ سے آسمانِ اوّل پر اسی ماہ میں اس کتابِ الہٰی کو اتارا گیا اور پھر رفتہ رفتہ تقریباً ۲۲ سال میں اسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کے پاس بذریعہ حضرت جبرئیلؑ امین بصورتِ وحی بھیجا گیا۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس نزول کا مطلب یہ ہے کہ ماہِ رمضان میں اس کی ابتدا ہوئی تھی۔ شب قدر کی تعیین میں اوّل ہی سے راویوں کی رائیں مختلف رہی ہیں لیکن حدیثیں کثرت سے اسی بات کے حق میں ہیں کہ نزولِ قرآن کی رات یعنی شبِ قدر ماہِ رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں سے کوئی ایک رات ہے اور زیادہ تر لوگ ستائیسویں یا تیئیسویں شب کو خصوصیت دیتے ہیں۔ غرض ماہ رمضان وہ مہینہ ہے جس میں انسانی کردار اور بشری نظام حیات کی درستی کے لیئے اور رہنمائی کیلیئے قرآنِ حکیم جیسا الہٰی منشور عطا ہوا ہے جس میں انسانی شعور و احساس کو ایسی بنیادیں بنادی گئی ہیں جن کے ذریعہ وہ آسانی کے ساتھ حق و باطل، ضلالت و ہدایت اور خیر و شر اور نیکی و بدی میں فرق کر سکتا ہے۔ نزولِ قرآن

کی شب یعنی لیلۃ القدر کی تعیین نہ ہوسکنے کی ایک خاص مصلحت یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ لوگ اس رات کو حاصل کرنے کی کوشش میں کئی راتوں میں دل لگا کر عبادت کریں اور زیادہ سے زیادہ ثواب حاصل کرسکیں۔ حدیث میں ہے کہ جو شخص اس شب میں خلوص کے ساتھ استغفار و عبادت کرتا ہے اللہ اپنے کرم سے اسکے سارے اگلے گناہ بخش دیتا ہے۔ مگر اس ارشاد نبوی کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے کہ لوگ محض اس اعتقاد سے کہ شب قدر میں عبادت کرکے تو سب گناہ ہم بخشوا ہی لیں گے اس لیئے سال بھر تک خوب جی بھر کے گناہ کرتے رہیں۔ نہیں ہرگز نہیں۔ یہ بات ممکن نہیں ہوسکتی بلکہ گناہ صرف ان کے بخشے جائینگے جو دل سے اپنی خطاؤں اور گناہوں پر شرمسار اور نادم ہوں اور یہ طے کریں کہ اب آئندہ جان بوجھ کر کوئی گناہ نہ کریں گے۔ اور کبھی حکم خدا و رسولؐ کی خلاف ورزی کا ارتکاب نہ ہوگا۔

اس مقام پر ایک بڑا بنیادی اور ضروری رخ غور و فکر کا ہمارے لیئے یہ بھی تو ہے کہ ماہ رمضان اور شب قدر

کی عظمت اس لیے بھی بڑھی کہ اس میں قرآنِ کریم اتارا
گیا اور ہمیں الٰہی ہدایت کا منشورِ اعظم ملا تو پھر ہمیں خود ہی سمجھ
لینا چاہیئے کہ خود قرآن کی عظمت اور اہمیت کیا ہوگی اور
جب ہم شبِ قدر اور شبِ نزولِ قرآن کی برکتوں کو حاصل
کرنے کی اس قدر کوشش کرتے ہیں تو یقیناً قرآن حکیم کو
سمجھنے اور اس کے ہدایات پر عمل کرنے کی ہمیں اس سے
زیادہ کوشش کرنا چاہیئے کہ اصلی غرض نزول قران کی یہی
ہے کہ اُسے غور سے پڑھا اور سمجھا جائے اور اس پر عمل
کیا جائے۔

بندگی ایک نعمت ہے

"بندگی" فروتنی، اطاعت اور فرمانبرداری ظاہر کرنے کا نام ہے اور اسی کو دوسرے لفظوں میں عبدیت اور عبودیت بھی کہتے ہیں۔ یہ لفظ عربی زبان میں اور خود قرآن حکیم میں کئی معنوں میں بولا گیا ہے مگر اس وقت اس کے اسی معنی سے بحث کی جا رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ عبدیت کا یہ مفہوم یعنی بندگی و عبودیت بغیر اطاعت و فرمانبرداری کے پیدا نہیں ہو سکتا۔ یوں تو جن لوگوں کو بھی اللہ نے پیدا کیا ہے وہ سب ہی اس کے عبد اور بندے ہیں۔ اَللّٰهُ لَطِيفٌ بِعِبَادِهٖ (شوریٰ) اللہ اپنے بندوں پر مہربان ہے۔ اِنْ تُعَذِّبْهُمْ فَاِنَّهُمْ عِبَادُكَ (انعام) عیسیٰ بن مریم نے کہا (اے پروردگار) اگر تو ان نافرمانوں پر عذاب کرے گا تو یہ تیرے بندے ہی تو ہیں (تو ان کا مالک ہے)

"يٰحَسْرَةً عَلَى الْعِبَادِ مَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ" (یٰسین ۳۰) بندوں کے حال پر افسوس ہے کہ کبھی اُن کے پاس کوئی پیغمبر

نہیں آیا مگر ہمیشہ وہ اس کے ساتھ مسخرا پن کرتے رہے۔ ان تمام آیات میں "عباد" سے مراد وہ لوگ ہیں جو بحیثیت مخلوق ہونے کے اللہ کے بندے ہیں اس مفہوم میں اطاعت، فروتنی اور فرمانبرداری کا کوئی تصور موجود نہیں ہے۔

اس وقت اس پیدائشی اور خلقی عبدیت سے بحث مقصود نہیں ہے بلکہ اس عبدیت و بندگی سے بحث کی جارہی ہے جس کے درجہ تک ایک عام بندہ صرف اطاعت و عبادت کے ذریعہ ہی سے پہنچ سکتا ہے اور اُسے عبودیت کی وہ منزل مل جاتی ہے جو خاصانِ الٰہی اور مقربانِ بارگاہ خداوندی کا حصہ ہے۔

اسی عبودیت و بندگی کی طرف قرآن حکیم میں جابجا اشارہ فرمایا گیا ہے۔ کبھی ان لفظوں میں: "وَاذْكُرْ عَبْدَنَا أَيُّوبَ"۔ اور ہمارے بندے ایوبؑ کو یاد کرو۔ کہیں حضرت نوحؑ کے ذکر میں اس طرح "إِنَّهُ كَانَ عَبْدًا شَكُورًا" بے شک نوحؑ ہمارے شکر گذار بندے تھے اور کسی مقام پر اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تذکرہ کرتے ہوئے "نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلَىٰ عَبْدِهِ" اس نے اپنے بندہ پر قرآن نازل فرمایا (سورہ فرقان) "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ" ہر طرح کی تعریف اللہ ہی

کی ذات کے لئے سزاوار ہے جس نے اپنے بندے پر کتاب یعنی قرآن کو نازل کیا (سورۂ کہف) سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا۔" وہ اللہ ہر عیب سے پاک ہے جو اپنے بندہ کو راتوں رات مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ کی طرف لے گیا۔ (سورۂ اسراء) فَاَوْحٰٓی اِلٰی عَبْدِہٖ مَآ اَوْحٰی" پس اللہ نے اپنے بندہ پر جو وحی چاہی بھیج دی (سورۂ النجم) یہی وہ منزل عبدیت و بندگی ہے جس کی طرف سورۂ حجر میں ان لفظوں میں اشارہ فرمایا گیا ہے" اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَکَ عَلَیْھِمْ سُلْطَانٌ" اے شیطان تجھے میرے مخلص بندوں پر کسی طرح کی بھی حکومت حاصل نہ ہوگی۔

میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ بندگی۔ انکسار، فروتنی اور اطاعت و فرمانبرداری کا نام ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی چھوٹا اپنے بڑے کی اطاعت کرتا ہے تو وہ اس چھوٹے کو اطاعت و خدمت کے صلے میں اپنی بارگاہ میں تقرّب اور بلندی دیا کرتا ہے اور اس طرح جو کچھ اور جس قدر بھی بلندی اور تقرّب ملتا ہے وہ مرتبۂ اطاعت و عبدیت کے مطابق ہی ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ عام انسان پیغمبر ولی کے برابر اطاعتِ خدا نہیں کرتے اسی لئے انہیں وہ تقرّب بھی

حاصل نہیں ہوتا جو انبیاءؑ کو ملتا ہے پھر اُن کے بھی درجے الگ الگ ہیں۔ اللہ کا قرآن حکیم میں ارشاد ہے: تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَّنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ (البقرہ ۲۵۳) ان پیغمبروں میں سے بعض کو ہم نے بعض پر فضیلت عطا کی ہے۔ ان میں سے کچھ تو ایسے ہیں جن سے خود اللہ نے بات کی اور ان میں سے بعض کے درجے اس نے بلند کئے ہیں۔ غرض اطاعت و عبدیت ہی سے تقرب کی بلندی ملتی ہے اور تقرب ہی سب سے بڑی بنیاد ہے اُس منصب الٰہی کی جسے ہم نبوت و رسالت کہتے ہیں اور اُس حکومت و اقتدار کی جو اللہ اپنے پیغمبروںؑ کو اپنی کل مخلوق پر عطا فرماتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اسے یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح کوئی بندہ اپنے پروردگار کا محکوم اور فرمانبردار بنتا ہے۔ اسی درجۂ اطاعت و محکومیت کے مطابق اُسے اللہ کی مخلوق پر حکومت ملتی ہے۔ یعنی عبودیت و فرمانبرداری اللہ کے سامنے اور حاکمیت تمام کائنات کے مقابلے میں اسے حاصل ہوتی ہے۔ پھر یہی درجۂ اطاعت اور مرتبۂ عبدیت ہی کا فرق ہے جس نے پیغمبروںؑ کے مرتبوں میں بھی فرق پیدا کیا ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ جس طرح

تقرب کے بغیر نبوت و رسالت کی منزلت نہیں مل سکتی اسی طرح خود تقرب بھی بغیر عبودیت و اطاعت کے ممکن نہیں ہے اور اسی لئے کہ یہ عبدیت و عبودیت ہر تقرب کی بنیاد ہے اور منصبِ نبوت و پیغمبری کی بھی اصل و اساس ہے، نماز میں جو افضل عبادات ہے رسالت محمدیؐ کی گواہی سے قبل حضورؐ انور کی عبدیت ہی کی گواہی دی جاتی ہے اور خود قرآن حکیم میں بھی آپ کی عبدیت ہی پر زیادہ زور دیا گیا ہے۔ پھر اسی معیارِ عبدیت ہی کی بنا پر سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تمام انبیاء کے سردار اور افضل کائنات ہیں اس لئے کہ مرتبۂ عبدیت میں حضورؐ سب سے آگے ہیں اور اسی وجہ سے کہ آپ کی ذات اقدس بارگاہِ الٰہی میں پوری کائنات سے بلند تر ہے آپ کو معراج کی وہ بلندی عطا ہوئی جو نہ کسی ملک مقرّب کو مل سکی اور نہ کسی نبی و رسول کو عطا ہوئی اور مقامِ "سِدْرَةُ الْمُنْتَهىٰ" پر پہنچ کر شب معراج امین وحی حضرت جبرئیل کو یہ کہنا پڑا کہ "لَوْ دَنَوْتُ اَنْمُلَةً لَاحْتَرَقْتُ" اگر میں اس منزل سے آگے بڑھوں گا تو شدّتِ نور سے جل اٹھوں گا۔

عبدیّت کا یہی مفہوم ہے جس کی طرف قرآن نے بار بار اشارہ

کیا ہے۔ کہیں ان لفظوں میں "كُونُوْا عِبَادًا لِّي" "تم لوگ میرے بندے بن جاؤ" اور کبھی حدیث قدسی میں اس طرح فرمایا گیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے "اے میرے بندے! "كُنْ لِّي أَكُنْ لَكَ" تو میرا ہو جا تو میں تیرا ہو جاؤں پھر کون یہ بات نہیں جانتا کہ جب اللہ کسی بندہ کا ہو جائے گا تو اس کی ساری مخلوق اور پوری کائنات بھی اس کی تابع و محکوم ہو گی۔ اور وہ عبد خاص اللہ کی عطا کی ہوئی طاقت اور اقتدار سے زمین و آسمان اور کائنات کے ذرہ ذرہ میں جو چاہے گا تصرف کر سکے گا۔ اسی تصرف کی ایک خاص قسم "معجزہ" کہلاتی ہے۔ بہر حال انسان کی بلندی اسی میں ہے کہ وہ اطاعت و عبدیت کے ذریعہ سے تقرب الٰہی کی منزل حاصل کرے اور اطاعت و عبدیت کا حصول صرف اُسی وقت ممکن ہے جب، انسان احکام خداوندی کو سمجھ کر ان پر عمل کرے۔ اس طرح کہ اطاعت کا مفہوم کسی خاص جہت میں محدود نہیں ہے بلکہ انسان کی پوری زندگی پر حاوی ہے۔ اعضاء و جوارح کا استعمال منشاء خداوندی کے مطابق ہو، عقل و فکر کا استعمال امر الٰہی کے مطابق ہو اور انسان آفاق و انفس کی گہرائیوں کو سمجھنے کی کوشش کرے، ان کے رازہائے سربستہ

کو اجاگر کرے اور ان سے وہ فائدہ اٹھائے جس کا اسے استحقاق حاصل ہے اور جس کی صلاحیت اس کی پیدائش میں رکھی گئی ہے۔ غرض انسان کا اپنی پوری زندگی اور اپنی پوری مادی اور روحانی طاقت و صلاحیت کو اللہ کے منشاء کے مطابق استعمال کرنا ہی عبودیت کا حاصل اور یہی دینوی اور اُخروی ہر قسم کی ترقی کی اصل ہے۔ اس کے ساتھ ہی عبدیت کے مفہوم کی تکمیل محض اسی وقت ہو سکتی ہے جب ہر عمل میں خلوص ہو اور جو بات بھی ہو صرف اللہ کے لئے ہو جس کی طرف قرآن حکیم میں اس طرح ارشاد فرمایا گیا ہے (سورۂ انعام ۱۶۲)

"اے رسول کہہ دو کہ میری نماز اور میری عبادتیں اور میری زندگی اور موت اللہ ہی کے لئے ہے جو سارے جہان کا پروردگار ہے۔

اور ظاہر ہے کہ اس منزل تک پہنچنا آسان بات نہیں ہوتی۔ اس راہ میں کانٹے ہیں، خطرے ہیں، مشکلات ہیں اور قدم قدم پر امتحان و آزمائش کی کٹھن منزلیں ہیں وہ جن کے رتبے ہیں سوا انکو سوا مشکل ہے"۔ ایمان ہے تو امتحان بھی ہوگا اور عبدیت ہے تو طرح طرح سے آزمائش بھی ہوگی اور اسی آزمائش میں جس قدر کامیابی حاصل ہوگی انسان کا درجہ بلند ہوتا جائے گا۔

اللہ اپنے مؤمن بندوں ہی کا امتحان لیتا ہے۔ کبھی بھوک سے

کبھی پیاس سے، کبھی غربت و افلاس سے اور کبھی موت اور شہادت سے، کبھی زلزلوں کی تباہ کاریوں سے کبھی طوفانوں کی مصیبتوں اور بلاؤں سے۔ لیکن اصلی مؤمن تو وہی ہوتے ہیں جنھیں طوفان اور زلزلے اور آفات ارضی و سماوی اپنی جگہ سے جنبش نہ دے سکیں۔ ایسے ہی بہادر اہل ایمان اللہ کی بارگاہ میں بلندیوں اور تقرب کے مستحق ہوا کرتے ہیں اور ایسے ہی صابر و شاکر اور مثالی انسانوں کے لئے اللہ نے قرآن حکیم میں فرمایا ہے (بقرہ پ ۲ ۱۵۵ ۱۵۶): اور ہم یقیناً تمہاری آزمائش کرینگے کچھ خوف اور بھوک سے اور مال اور جان اور پھلوں کے نقصان سے اور اے رسول صبر کرنے والوں کو خوشخبری دیدو جو ایسے ہیں کہ جب کبھی ان پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ کہنے لگتے ہیں۔ بیشک ہم اللہ ہی کے لئے ہیں اور ہم اسی کی طرف پلٹنے والے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی طرف سے عنایتیں ہیں اور رحمت بھی اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں" اللہ ہمیں حقیقی ایمان کی دولت سے نوازے اور آفات ارضی و سماوی پر صبر و تحمل کی توفیق عطا فرمائے اور جرأت و ہمت و استقلال دے جو صرف مردانِ حق ہی کو عطا ہوتا ہے۔

خدا فراموشی کا نتیجہ خود فراموشی ہے

سورۃ الذّاریات میں اللہ کا ارشاد ہے: وَفِی الْاَرْضِ آیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ ۝ وَفِیْٓ اَنْفُسِکُمْ ط اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ۔" اور زمین میں نشانیاں موجود ہیں یقین رکھنے والوں کے لیئے اور خود تمہارے اندر بھی ہیں تو کیا تم دیکھتے نہیں۔ (آیہ ۲۱/۲۰)

اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص کائنات میں پھیلی ہوئی اللہ کی نشانیوں کو نہیں دیکھتا اور نہیں سمجھتا تو یقیناً وہ اُن آیاتِ الٰہیہ کو بھی نہیں سمجھتا اور ان سے بھی غافل ہے جو اُس کے اپنے وجود اور اپنی ہستی کے اندر موجود ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ جو انسان اللہ کی عظمت سے بے خبر ہے وہ یقیناً خود اپنی ذات کو بھی نہیں جانتا کہ اسے اللہ نے کیا مقام عطا کیا ہے، اس کے وجود میں کیا کیا راز پوشیدہ ہیں، کیا کیا بلندیاں رکھی گئی ہیں اور کائنات

کے معاشرہ میں اسے کیا مرتبہ حاصل ہے۔ ایک دوسرے انداز میں سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی ایک مشہور حدیث میں اسی بات کو یوں فرمایا ہے: مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ۔ جو شخص اپنے نفس کو نہیں پہچانتا وہ اپنے پروردگار کی بھی معرفت نہیں رکھتا۔

اس کا منطقی نتیجہ یہی ہوا کہ جو شخص اپنے اللہ کو نہیں پہچانتا اور خدا فراموشی کا مرتکب ہوگا وہ یقیناً خود فراموشی کی بلا میں بھی مبتلا ہو کر رہے گا۔ حضرت علی بن ابی طالب علیہ السلام نے بھی حضور انور کے ان ہی الفاظ کا بارہا ذکر کیا تھا۔ اور کبھی اسی مفہوم کو اس طرح بیان فرمایا تھا: ھَلَکَ امْرُءٌ لَمْ یَعْرِفْ قَدْرَہٗ۔ وہ شخص درحقیقت ہلاک ہو گیا جو خود اپنی قدر اور اپنا مقام نہ جانتا ہو۔

غرض قرآن و حدیث کے ذریعہ سے ہمیں اسلام نے یہ بتا دیا ہے کہ انسان کے نفس اور اس کی ذات میں کس قدر اہمیت ہے اور یہ اہمیت درحقیقت اس وقت آنکھوں سے چھپ جاتی ہے جب وہ خدا فراموشی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ جس کا حاصل یہی ہے کہ جس قدر آدمی خدا کو

یاد رکھے گا، اس کی معرفت حاصل کرنے کی کوشش کرے گا اس کے کمالِ قدرت کو سمجھتا جائے گا اور اس کی قدرت کے سربستہ راز اس کی عقل اور ضمیر کے سامنے ابھرتے جائیں گے اسی قدر وہ اس حقیقت کو بھی سمجھنے کے قابل بنے گا کہ ایسے قادر و حکیم پروردگار نے اپنی جس مخلوق کو کائنات میں سب سے بہتر بنایا ہے اور اسے اشرف مخلوقات کا لقب عطا فرمایا ہے اسکی منزل کتنی بلند ہے، اس میں اپنی زبردست قوتوں کا شعور پیدا ہو گا، اس میں خود اعتمادی کے جذبہ کی تخلیق ہوگی، پوری کائنات پر اپنی سرداری کا پتہ چلے گا اور ضمیر میں عزتِ نفس کی اعلیٰ صفت پیدا ہوگی اور پھر ایسا باشعور اور باضمیر انسان کبھی غیر اللہ کی چوکھٹ پر اللہ کو چھوڑ کر جبیں سائی نہیں کر سکتا کبھی اپنے سے پست مرتبہ مخلوق کے آگے گڑ گڑا نہیں سکتا اور اس کے نفس کی بلندی کبھی اس کو اخلاقی پستیوں کی طرف جانے کی اجازت نہیں دے سکتی کیونکہ اسے اس بات کا پورا پورا احساس ہو گا کہ سارے جہان کے خالق اور پروردگار نے اس کو اپنی پوری مخلوق

پر سرداری عطا فرمائی ہے اس لیئے جو کچھ بھی اس سرداری کے تقاضے ہیں انھیں پورا کرنا اس کی ذمہ داری ہے اور اس ذمہ داری کو پورا نہ کرنا اور اس سے غافل رہنا اس کی علامت ہے کہ ایسا انسان یہ جانتا ہی نہیں کہ اس کا خالق کتنی عظیم قدرت اور حکمت کا مالک ہے۔ اس گفتگو کا نتیجہ یہی ہوا کہ انسان جس قدر بھی اپنے خالق کی عظمت و قدرت سے آگاہی حاصل کرتا جائے گا اُسے خود اپنے مقام اور اپنی ذات کی قیمت کا اندازہ ہو گا اور اس کے کانوں میں کسی کی یہ صدا گونجنے لگے گی:

نہ تو زمیں کے لیئے ہے نہ آسماں کیلئے
جہاں ہے تیرے لیئے تو نہیں جہاں کیلئے

قرآن حکیم نے اسی لیئے انسان کو بار بار اللہ کی قدرت اور اس کی نشانیوں پر غور و فکر کرنے کی دعوت دی ہے اور حدیثوں میں اس کا اعلان موجود ہے کہ ایک گھنٹہ کائنات پر غور و فکر کرنا ساٹھ برس کی عبادت سے افضل ہے جس میں تفکر نہ ہو حضورؐ انور کا ارشاد ہے: دِیۡنُ الۡمَرۡءِ عَقۡلُهٗ وَمَنۡ لَا عَقۡلَ لَهٗ لَا دِیۡنَ لَهٗ " یعنی انسان کا دین اس کی فکر و عقل ہے

اور جس کے پاس عقل نہیں ہے یعنی وہ عقل و فکر سے کام نہیں لیتا اس کا دین نہیں ہے۔ حضرت علی بن ابیطالب علیہ السلام نے فرمایا ہے: "نَبِّہْ بِالتَّفَکُّرِ قَلْبَکَ" غور و فکر کے ذریعہ سے تم اپنے قلب کو بیدار کرو۔ قرآنِ حکیم میں (بقرہ ۲۶۶) فرمایا گیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے۔ اللہ اپنی آیتوں کو بیان کرتا ہے تمہارے لیئے تاکہ تم ان پر غور و فکر کرو۔ ایک مقام پر سورۂ لقمان میں ارشاد ہوا ہے جس کا حاصل یہ ہے۔ کیا تم لوگوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے وہ سب کا سب اللہ نے تمہارا تابع بنا دیا ہے (آیہ ۲۰) سورۂ روم میں ہے۔ کیا لوگوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ آسمانوں اور زمین اور ان کے درمیان جو کچھ بھی اللہ نے پیدا کیا ہے وہ سب بالکل برحق اور درست ہے۔ (آیہ ۸)

سرورِ کائنات کا ارشاد ہے۔ لَاعِبَادَۃَ کَالتَّفَکُّرِ فِیْ صَنْعَۃِ اللّٰہِ" اللہ کی صنعت و قدرت میں غور و فکر سے بڑھ کر کوئی عبادت نہیں ہے۔ اور پھر اس فکر و نظر کا نتیجہ وہی نکلے گا جیسے ابھی عرض کیا گیا۔ یعنی کائنات

پر انسان کی برتری اور اس برتری کے ساتھ ہی اس بات کا گہرا احساس کہ اس عظیم خالق نے اپنی اس بہترین مخلوق کو بیکار اور لاحاصل نہیں بنایا ہے بلکہ اس تخلیق کی کوئی نہ کوئی غرض ہے جسے پورا کرنا چاہیئے اور اس مخلوق کا فرض ہے کہ یہ اُس غرض اور اُن ذمہ داریوں کو پورا کرے جو اس کی پیدائش کا سبب ہیں۔ اس بنا پر انسانی شعور اپنی بلندیوں اور اپنے مقام سے آگاہی حاصل ہی نہیں کر سکتا جب تک انسان کے دل میں معرفتِ الٰہی موجود نہ ہو اور وہ اپنے خالق کی عظمت سے آگاہی حاصل نہ کر لے۔ اسی گہرے بنیادی نظریہ کی طرف سورۂ آل عمران میں قرآن حکیم نے یہ کہکر اشارہ کیا ہے۔ وَ اَنتُمُ الاَعلَونَ اِن کُنتُم مُّومِنِینَ" اگر تم میں سچا ایمان ہے یعنی اگر تم میں خداشناسی کا جوہر موجود ہے تو پھر تم ہی ہمیشہ سب پر غالب رہو گے۔ (آیہ ۱۳۹)

مختصر یہ کہ انسان کے لیئے خودی کا صحیح تصوّر ممکن ہی نہیں ہو سکتا جب تک اس کے ضمیر میں خداشناسی کا جوہر موجود نہ ہو اور جب تک وہ اپنے عظیم خالق کی ذات

اقدس کی معرفت حاصل نہ کرے وہ اپنے نفس اور اپنی ذات کی قدر و قیمت سے آگاہ ہی نہیں ہو سکتا یہی آگاہی دوسرے لفظوں میں اسلام و ایمان ہے اور یہی غفلت و جہالت کفر و شرک ہے۔ یہی آگاہی اور یہی دولتِ فکر و نظر جامِ حیاتِ ابدی ہے اور یہی بے خبری انسان کے لیئے ساغرِ موت و فنا ہے۔ جو اللہ کو فراموش کرتا ہے، کائنات کی غلامی اس کی قسمت بنتی ہے اور جو اللہ کی عظمت کو پہچانتا ہے کائنات کی سرداری اس کا مقدر ہو جاتی ہے۔

علم کی فضیلت

"قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ"

اے پیغمبرؐ لوگوں سے پوچھو کیا علم رکھنے والے اور جاہل دونوں برابر ہیں (سورۃ الزمر آیہ ۹)

یعنی یہ دونوں کسی طرح برابر نہیں ہو سکتے بلکہ علم رکھنے والے ان لوگوں پر جو علم سے محروم ہیں بڑی فضیلت رکھتے ہیں۔ قرآن حکیم میں لفظ "اللہ" کے بعد سب سے زیادہ تکرار جس لفظ کی ہے وہ لفظ "علم" ہے۔ یہ بات اس حقیقت کا واضح ثبوت ہے کہ اسلام کے نزدیک علم کا درجہ بہت بلند ہے اور اس کا سب سے بڑا مقصد یہی ہے کہ دنیا سے جہالت کو دور کیا جائے اور علم کا رواج ہو۔

جہاں تک علم کی فضیلت کا تعلق ہے اس کا ثبوت اسقدر صاف اور روشن ہے کہ اس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت محسوس نہیں کی جا سکتی۔ وہ کون صاحب عقل و ہوش ہے جو جہالت

کو علم و دانش سے افضل جاننا ہو اور اس کا دعویٰ کرنے کی جرأت کر سکتا ہو کہ علم میں کوئی فضیلت اور برتری نہیں ہے! علم انسانی فطرت کا سب سے بڑا تقاضا ہے۔ انسان جس وقت پیدا ہوتا ہے اور اس دنیا میں پہلا قدم رکھتا ہے اسی وقت سے وہ کسی نہ کسی صورت میں علم کی تلاش شروع کر دیتا ہے اور اگر اس کی فطرت میں یہ بات نہ ہوتی تو وہ کسی حالت میں بھی زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ اس حقیقت کو ہم یوں بھی سمجھ سکتے ہیں کہ وجود افضل ہے عدم سے دوسرے لفظوں میں مخلوقات اور کائنات کے نہ ہونے سے اس کا ہونا یقیناً بہتر ہے پھر جو چیزیں پیدا ہوئی ہیں اور خدا نے انھیں وجود کی نعمت عطا فرمائی ہے اُن میں کچھ ایسی مخلوق ہے جو بے حس اور بے شعور ہے اور کچھ وہ چیزیں ہیں جن میں حس اور شعور کی صفت پائی جاتی ہے اور یہ امر واضح ہے کہ احساس و شعور رکھنے والی مخلوق بے حس پتھروں سے قطعی طور پر افضل اور اشرف ہے بس اسی طرح شعور اور سمجھ رکھنے والی مخلوق میں کچھ وہ ہیں جو علم رکھتے ہیں اور کچھ وہ ہیں جو یہ صفت نہیں رکھتے اور یہ بات واضح اور صاف ہے کہ علم کا ہونا یقیناً بہتر ہے اُس کے

ہونے سے اس طرح اس بحث کا بہت آسانی کے ساتھ یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ علم رکھنے والی مخلوق کائنات کی ہر مخلوق سے افضل ہے علم کی فضیلت اور اہمیت پر حدیث کے یہ الفاظ بڑی معیاری حیثیت رکھتے ہیں " اَلْعِلْمُ حَیَاتُ الْاِسْلَامِ وَعِمَادُ الدِّیْنِ" علم اسلام کی حیات اور دین کا ستون ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر علم کو اسلام سے الگ کر دیا جائے تو اس کا کوئی تصور اور کوئی وجود باقی نہیں رہ سکتا۔

اسی کے ساتھ جبکہ یہ بات عقلی اور دینی سطح پر پوری طرح مسلّم اور ثابت ہے کہ کائنات کی تمام چیزیں انسان کے فائدہ کے لیئے بنائی گئی ہیں اور قرآنِ حکیم نے بار بار اس کا اعلان بھی صاف لفظوں میں کر دیا ہے کہ یہ پوری کائنات خدا نے انسان کے لیئے مسخر کر دی ہے اور اسی کے لیئے بنائی ہے۔ تو ایسی صورت میں انسان کے لیئے بے حد ضروری ہے کہ جس کائنات سے اس کی زندگی، بقا اور ہر فائدہ کا تعلق ہے اس کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش کرے اور اپنی صلاحیتوں کے مطابق ان فائدوں کا علم حاصل کرے جو اس کے اندر پوشیدہ ہیں کیونکہ جب تک انسان کو ان کا علم نہ ہوگا یہ تسخیر بے معنی اور لا حاصل

ہوگی اور چونکہ یہ فائدے انسان کی زندگی کے ہر رخ اور ہر شعبہ سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے یہ امر بھی ضروری ہے کہ علم کو بھی غیر ضروری قیدوں کا پابند نہ بنایا جائے اور اسے حیاتِ انسانی کے ہر شعبہ میں پھیلایا جائے۔

علم کی فضیلت کو ہم اس طرح بھی سمجھ سکتے ہیں کہ جہاں علم ہوتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ طاقت وہیں ہوتی ہے اور اس کے برخلاف جہاں جہل ہوتا ہے وہاں کمزوری ہوتی ہے مثال کے طور پر دیکھئے۔ ہم جس راستہ سے واقف نہ ہوں اور نہ جانتے ہوں کہ اس میں کہاں پر اتار ہے، کہاں چڑھاؤ ہے، کہاں سیدھا ہے کہاں اس میں موڑ ہے، اور کہاں وہ بے خطر ہے اور کہاں پر اس میں خطرے ہیں تو ہم اس راستہ پر چلنے میں ڈریں گے اور قدم قدم پر خوف اور کمزوری کا احساس کریں گے لیکن اگر ہمیں راستہ کے تمام تفصیلات کا پورا علم ہوگا تو رات کے اندھیرے میں بھی اس پر جانے میں کوئی دقت اور پریشانی محسوس نہ کریں گے بس اسی طرح اگر ہم تھوڑا سا بھی غور کریں تو ہمیں یہی بات اپنی زندگی سے متعلق ہر چیز میں نظر آئے گی کہ جہاں جہاں علم ہے وہاں طاقت ہوتی ہے اور جہاں جہالت ہے وہاں ضعف اور کمزوری ہوا کرتی

ہے اور ظاہر ہے کہ ترقی اور زندگی، ناتوانی اور ضعف میں نہیں ہوتی بلکہ طاقت اور قوت میں ہوتی ہے اس لیئے یقینی طور پر انسان کی عقلی اور مادی، روحانی اور جسمانی زندگی کی فلاح و نجات اور ہر قسم کی بہبود اور قوت منحصر ہے صرف علم پر۔ یہی اس کی حقیقی زندگی ہے اور اسی میں اس کی ترقی کے سارے راز چھپے ہوئے ہیں اور اس کے مقابلہ میں جہل اور بے علمی اس کے لیئے سب سے بڑی کمزوری سب سے بڑا خطرہ اور اس کی ترقی کے لیئے سب سے بڑی مزاحمت اور رکاوٹ ہے۔

اس بحث میں دو باتیں خاص طور پر غور طلب ہیں ایک یہ کہ آدمی کے لیئے کس قسم کا علم فضیلت رکھتا ہے اور دوسری بات یہ ہے کہ کیا صرف علم ہی ضروری ہے اور اسی میں فضیلت ہے اور اس کے ساتھ عمل لازم نہیں ہے؟ اسلام نے ان دونوں مسئلوں کا پوری طرح حل بتا دیا ہے۔ سورۂ زمر میں خدا کا ارشاد ہے:۔ (آیہ ۱۸)

فَبَشِّرْ عِبَادِ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ط اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ"۔

اے رسولؐ تم میرے خاص بندوں کو خوشخبری دیدو جو باتوں کو دل

لگا کر سنتے ہیں اور پھر ان میں سب سے اچھی بات پر عمل کرتے ہیں یہی لوگ وہ ہیں جن کی خدا نے ہدایت کی ہے اور یہی لوگ عقلمند ہیں۔" اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ جو باتیں ہمیں معلوم ہوتی ہیں اور جن چیزوں کا ہم علم حاصل کرتے ہیں ان میں کچھ بُری ہوتی ہیں اور کچھ اچھی ہوتی ہیں اور ہمارے لیئے صرف ان ہی چیزوں کا علم اور ان پر عمل مفید اور ضروری ہے جو اچھی ہوں اور ساتھ ہی یہ چیز بھی طے شدہ ہے کہ اچھائی اور برائی کا تعین ہم اپنی محدود سمجھ اور محدود علم سے نہیں کر سکتے۔ جو ماحول کے تقاضوں اور لا محدود حیوانی خواہشات کی بندشوں میں جکڑا رہتا ہے بلکہ اس کا تعین صرف قانونِ الٰہی اور ضوابطِ خداوندی کے ذریعہ ہی ہو سکتا ہے۔ اس لیئے وہی علم انسان کی فضیلت کا سبب ہے اور وہی علم فضیلت رکھتا ہے جس کی وجہ سے ہم اُن نیکیوں کو حاصل کر سکیں جو خدا نے اپنے پیغمبرؐ کے واسطہ سے ہمیں تعلیم کر دی ہیں اور درحقیقت اولوالالباب (یعنی صاحبانِ عقل) قرآن کے نزدیک صرف وہی لوگ ہیں جو اپنی علمی صلاحیتوں کو اُن نیکیوں کی تحصیل میں صرف کریں۔ ایسے ہی علم کا طلب کرنا ہر مسلمان کے لیئے فرض قرار دیا گیا ہے۔ اور

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا فرمان ہے، "طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ" ہر مسلمان پر علم کا طلب کرنا فرض ہے اور یہی وہ علم ہے جس کے لیئے دوسری حدیث میں ہے : علمی باتوں میں ایک گھنٹہ گزار دینا خدا کے نزدیک ایک ہزار راتوں کی عبادت سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے "۔ خلاصہ یہ ہوا کہ علم کی فضیلت تو ہر طرح مسلّم ہے لیکن اس علم سے مراد وہی علم ہے جس سے انسان اپنی خلقت کے صحیح تقاضوں کو پورا کر سکے اور جس سے وہ اپنے خالق کی معرفت حاصل کر سکے اور اس کے حق کو ادا کر سکے اور وہ علم جس سے انسان کائنات کے اسرار کو خدا کے بنائے ہوئے وسیلوں سے معلوم کر سکے اور ساتھ ہی یہ بات بھی پوری طرح ظاہر ہے کہ علم کی فضیلت کا اس وقت تک کوئی نتیجہ اور حاصل نہیں ہو سکتا جب تک اس کے ساتھ عمل نہ ہو اور جب تک اس کے تقاضوں کے مطابق صحیح اور معتدل کردار کی تشکیل نہ کی جائے۔

اسلامی معیشت

اسلامی معیشت کی اہم ترین بنیاد اللہ کا یہ ارشاد ہے: جَعَلَكُم مُّسْتَخْلَفِينَ فِيهِ" (سورۂ حدید) اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لاؤ اور جس مال میں اُس نے تم کو اپنا نائب بنایا ہے اس میں سے خرچ کرو۔ پھر کچھ آگے بڑھ کر فرمایا گیا ہے: وَمَا لَكُمْ أَلَّا تُنفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ"۔ اور تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے حالانکہ سارے آسمانوں اور زمین کی وراثت اللہ ہی کی ہے (آیہ ۱۰)

قرآنِ حکیم نے اسلامی نظامِ معیشت کے اس ضروری پہلو کی جو وضاحت کی ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ ہم جو کچھ بھی خرچ کریں وہ سب الٰہی فرمان کے مطابق ہو اور اس یقین کے ساتھ ہو کہ ہمارے قبضہ میں جو چیز بھی ہے وہ سب اسی کی ملکیت ہے اور ہم اس کے صرف نائب کی

حیثیت رکھتے ہیں - اسی بنیادی نظریہ کی طرف قرآنِ پاک میں متعدد مقامات پہ ارشاد فرمایا گیا ہے - چنانچہ سورۂ آلِ عمران میں ایک جگہ پر یہ لفظ ہیں: لِلّٰہِ مُلْکُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ" یعنی تمام آسمانوں اور زمین کی سلطنت اللہ ہی کی ہے - پھر ظاہر بات ہے کہ جب اصلی سلطنت اور بادشاہت صرف اُسی کی ہے تو اس کی مخلوق کو اُن چیزوں پر کوئی اختیار نہ ہوگا جن کے لیئے وہ اجازت نہ دے اور محض اُن ہی چیزوں پر اس کو اختیار حاصل ہو سکے گا جس کے واسطے اُس کی اجازت مل چکی ہو - دوسرے لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ ہمارے سرمایہ اور دولت کا بھی اسی طرح اصلی مالک ہے جس طرح وہ اُن وسیلوں کا مالک ہے جن سے ہماری دولت حاصل ہوتی ہے -

اگر ہم اس حقیقت کو تفصیل کے ساتھ سمجھنا چاہیں تو ہم دیکھیں گے کہ جن وسائل سے سرمایہ حاصل ہوتا ہے ان میں سے ایک چیز "زمین" ہے یا وہ چیزیں ہیں جو زمین سے نکلتی ہیں یا اس کے ساتھ پائی جاتی ہیں مگر ان میں سے کوئی چیز بھی ہماری پیدا کی ہوئی نہیں ہے بلکہ یہ سب اللہ کی

خلق کی ہوئی ہیں اور وہی ان کا اصلی مالک وحاکم ہے۔

ہمارا کام تو بس اتنا ہے کہ ہم ان کو اپنے کام میں لاتے رہیں اور ان سے فائدہ اٹھاتے رہیں۔ بے شک اسی نے زمین کو پیدا کیا ہے۔ وہی پانی اور آگ کا خالق ہے اور اسی نے ہوا، بجلی، لوہا، پتھر، معدنی چیزیں اور اسی قسم کی تمام اشیاء کو پیدا کیا جو ہم اپنی ضروریاتِ زندگی کے لئے استعمال میں لاتے ہیں۔ زمین اور زمین کی چیزوں کے علاوہ جن وسیلوں سے سرمایہ حاصل کیا جاتا ہے ان میں سے ایک اور بنیادی چیز "محنت" ہے۔ اگر انسان محنت نہ کرے تو وہ دولت اور سرمایہ حاصل نہیں کر سکتا۔ مگر دیکھنا تو یہ ہے کہ اس میں یہ طاقت وقوت کس نے دی ہے کہ وہ محنت اور کوشش سے کام لے سکے اور کس ذات نے اسے اسقدر عقل اور فہم عطا کیا ہے کہ وہ اس سے مدد لے کر اپنے اور دوسروں کے فائدہ کے لئے مناسب عملی صورتیں اختیار کر سکے۔

مختصر یہ کہ اسلامی نظام معیشت کا اہم ترین بنیادی نظریہ صرف یہ ہے کہ ہر چیز کا اصلی مالک اللہ ہے اور انسان

محض اس کے نائب اور امین کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس معاشی نظام کی دوسری اہم بنیاد یہ ہے کہ سرمایہ کی ذخیرہ اندوزی نہ کی جائے۔ جس کا نام قرآنی اصطلاح میں "کنز" ہے۔ سورۂ توبہ میں اللہ کا ارشاد ہے: (ترجمہ) جو لوگ سونے اور چاندی کو جوڑ جوڑ کر رکھتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے (اے رسولؐ) انھیں تم دردناک عذاب کی خبر دیدو (آیہ ۳۴)

مطلب یہ ہے کہ سرمایہ محض جمع رکھنے کے لئے حاصل نہ کیا جائے بلکہ اس سے فرد اور معاشرہ دونوں ہی کو فوائد حاصل ہوتے رہیں اور ان کے کام میں آتا رہے۔ ظاہر ہے کہ اگر سرمایہ کی ذخیرہ اندوزی کی جائے گی تو پھر انسان ترقی کے میدان میں ایک قدم بھی آگے نہ بڑھ سکے گا خواہ وہ انفرادی ترقی ہو یا اجتماعی۔

اس نظام معیشت کا تیسرا بنیادی نظریہ یہ ہے کہ دولت پر چند مخصوص لوگوں کی اجارہ داری قائم نہ رہنے دی جائے یعنی ایسا نہ ہو کہ کچھ لوگ تو دولت و ثروت کے انبار میں لوٹ رہے ہوں اور دوسرے ان ہی جیسے انسانی افراد روٹی کے

ایک ایک ٹکڑے کو ترستے ہوں چنانچہ اسی سلسلہ میں سورۃ حشر میں فرمایا گیا ہے (آیہ/۷) : (ترجمہ) "جو مال اللہ نے اپنے پیغمبرؐ کو دیہات والوں سے دلوایا ہے وہ اللہ کے اور اس کے رسولؐ کے اور ان کے قرابتداروں کے اور یتیموں، حاجتمندوں اور مسافروں کیلئے ہے تاکہ تم میں سے جو لوگ دولتمند ہیں صرف ان ہی کے درمیان وہ مال ہر پھر کر نہ رہ جائے" اس فرمانِ خداوندی سے اس بات کی وضاحت ہوگئی کہ اسلام یہی چاہتا ہے کہ دولت اور اس کے وسائل سے سب ہی لوگ فائدہ اٹھاتے رہیں اور وہ چند مخصوص افراد کے قبضہ میں پھنس کر نہ رہ جائے ورنہ یہ نتیجہ یقینی ہوگا کہ دوسرے لوگ اپنی قوتِ عمل اور کارکردگی کی صلاحیت اور اپنے جذبۂ محنت سے محروم ہو کر رہ جائیں گے اور پھر کوئی فرد یا جماعت ترقی کی راہ پر گامزن نہ ہو سکے گی۔

انسانی تاریخ کے ہر دور میں معاشیات کے مسائل کو انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے بڑی اہمیت حاصل رہی ہے لیکن موجودہ زمانہ میں یہ اہمیت بہت کچھ بڑھ چکی ہے۔ ان مسائل پر ماہرین معاشیات نے جس حد تک تحقیق اور جستجو سے

کام لیا ہے وہ بے حد قابلِ تحسین ہے لیکن انھوں نے اپنے لائق احترام جذبۂ تحقیق کے باوجود اس حقیقت کو کبھی اپنے پیش نظر نہیں رکھا کہ انسان اپنے سرمایہ اور دولت کا خود حقیقی مالک نہیں ہے بلکہ صرف امین اور نائب ہے جبکہ اُس کا اصلی مالک اللہ ہے۔

اگر انسان اسلام کے اِس نظریہ ملکیت کو خلوص دل سے تسلیم کرلے تو پھر سرمایہ کی تحصیل، اس کے مصارف اور اُسے جمع رکھنے میں ان تمام خطروں سے اس کو نجات حاصل ہو سکتی ہے اور وہ ان تمام غلطیوں اور بے اعتدالیوں سے محفوظ رہ سکتا ہے جن سے وہ اپنی ذاتی ملکیت کے اصول کو تسلیم کرنے کی صورت میں کبھی ہرگز نہیں بچ سکتا۔

پھر وہ کبھی اسراف اور فضول خرچی نہیں کرے گا اور نہ اپنے سرمایہ کو غلط مقاصد میں صرف ہونے دیگا۔ وہ کبھی کسی کی حق تلفی نہیں کرے گا اور کبھی ناجائز وسیلوں سے سرمایہ فراہم کرنے کی کوشش عمل میں نہیں لائے گا۔ انسانی معاشرہ میں ہمیشہ جو کچھ بے اعتدالی، ظلم وفساد، بدنظمی اور قانون عدل کی خلاف ورزی کی جاتی رہی ہے اُس کا ایک

بڑا سبب یہی ہے کہ انسان خود اپنے آپ ہی کو اپنی دولت اور سرمایہ کا حقیقی مالک اور حاکم سمجھتا رہا اور اس حقیقت سے ناآشنا رہا یا اس کا انکار کرتا رہا کہ اس کا مالک خود وہ نہیں بلکہ اس کا پروردگار ہے۔

اسی نقطۂ نظر کی روشنی میں قرآن حکیم نے انسانی معیشت کے ہر ضروری پہلو پر رہنمائی کی ہے اور نوعِ انسان کو اس کے فرائض اور ذمّہ داریوں سے آگاہی بخشی ہے تاکہ وہ اس رہنمائی اور ہدایت پر عمل کر کے عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کر سکے اور انسانی معاشرہ ظلم و جور اور حق تلفی و ناانصافی سے پاک ہو جائے۔ اُس نے ایک طرف وسائل دولت کی تطہیر کی اور اُن برائیوں سے آگاہ کیا جن کا سرمایہ کی تحصیل اور فراہمی میں انسان ارتکاب کر سکتا ہے تو دوسری طرف اس کے صرف کرنے میں جو بے اعتدالیاں اور غلطیاں ممکن تھیں اُن کی بھی پوری طرح وضاحت کر دی ہے۔

اس نے تجارتی کاروبار میں ذمّہ داریوں اور حقوق کی تعلیم دی ہے، زراعت و صنعت و حرفت کے معاملات میں بھی تمام ضروری حدود کی تشریح کر دی ہے اور محنت، مزدوری

اور ملازمت یا نجی باتوں کے متعلق بھی ہر اُس پہلو کو سمجھا دیا ہے جس کے سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت تھی۔ اس نے ناپ تول میں ناانصافی، دھوکا، ملاوٹ، جھوٹ، چوری، بد معاملگی، وعدہ خلافی، معاہدہ کی خلاف ورزی، امانت میں خیانت اور اسی طرح کی تمام برائیوں سے آگاہ کر دیا ہے تاکہ اللہ کے بنائے اور تعلیم دیئے ہوئے معاشی نظام کے سمجھنے میں کسی قسم کی بھی کوئی غلط فہمی باقی نہ رہنے پائے قرآنِ پاک نے تعلیم دی ہے کہ ایک دوسرے کا مال کبھی ناحق طریقہ پر نہ کھائے، چوری نہ کرے، رشوت نہ لے، سود نہ کھائے اور اسی طرح ایسی بہت سی چیزیں ہیں جو کثیر آمدنی کا ذریعہ بن سکتی ہیں مگر اسلام نے ایسی آمدنی کے دروازے قطعی طور پر بند کر دیئے ہیں۔

آمدنی کے جائز وسیلوں کا تعین کرنے کے ساتھ ہی اس نے اس کے مصارف پر بھی پابندیاں لگائی ہیں فضول خرچی کو ممنوع قرار دیا ہے۔ گناہوں کے کاموں میں سرمایہ صرف کرنے سے منع کیا ہے۔ ایسے امور میں سرمایہ کاری کی اجازت نہیں دی ہے جو شریعت کے خلاف اور معاشرے

کے لیے کسی حیثیت سے بھی ضرر کا باعث ہوں اور اسی کے ساتھ بخل اور ذخیرہ اندوزی کو بھی سختی کے ساتھ روکدیا ہے تاکہ اس طرح آمدنی اور خرچ دونوں میں عدل وانصاف کی قدریں محفوظ رہ سکیں اور دونوں ہی افراط و تفریط کی تباہ کاری سے محفوظ رہ سکیں۔

حضور صلعم اکرم نے اپنی حدیث میں معجزانہ جامعیت کے ساتھ اسلامی معاشی نظام کو مختصر لفظوں میں اسطرح بیان فرمایا ہے: (الخلق الکامل ج ۴ ص ۲۹۸)

رَحِمَ اللّٰہُ امْرَءً کَسَبَ طَیِّبًا وَّ اَنْفَقَ قَصْدًا وَّ قَدَّمَ فَضْلاً یَوْمَ فَقْرِہٖ وَحَاجَتِہٖ "اُس شخص پر اللہ کی رحمت ہو جو حلال روزی حاصل کرے اور میانہ روی کے ساتھ خرچ کرے اور کچھ سرمایہ جو باقی رہ جائے اس کو اپنے آڑے وقت کے لیے محفوظ رکھے"

اسلام نے حرص وطمع کی جڑیں یہ کہہ کر کاٹ دی ہیں:

لُعِنَ عَبْدُ الدِّرْہَمِ، لُعِنَ عَبْدُ الدِّیْنَارِ "درہم دینار کی پرستش کرنے والے پر اللہ کی لعنت ہے

اور چونکہ باہمی تعاون کے بغیر معیشت کا نظام قائم نہ رہ سکتا تھا اس لیئے یہ فرما کر کہ ایماندار لوگ آپس میں ایک دوسرے کے بھائی ہیں اُن میں باہمی یگانگت اور اخوّت کے جذبہ کو اجاگر کیا تاکہ آپس کے تمام معاملوں میں سب کے سب اسی مخلصانہ روح کے ساتھ کام کریں جو سگے بھائیوں میں ہوا کرتی ہے۔

ذکر اللہ کی کثرت

سورۂ احزاب[41] میں اللہ کا ارشاد ہے : یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اذْکُرُوا اللّٰہَ ذِکْرًا کَثِیْرًا " اے ایمان والو! اللہ کو کثرت سے یاد کیا کرو ۔ پھر اسی سورۂ احزاب میں یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیاتِ پاک صرف اُن ہی لوگوں کے لئے نمونۂ عمل ہے جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور کثرت سے اللہ کا ذکر کرتے ہیں۔ سورۂ آلِ عمران[190] میں ایک دوسرے انداز میں کثرتِ ذکرِ الٰہی کی طرف لوگوں کو توجہ دلائی گئی ہے ۔ وہاں بتایا گیا ہے کہ زمین و آسمان کی مخلوقات اور دن رات کی گردش میں "عقل والوں" کے لئے اللہ کی قدرت کی بڑی نشانیاں موجود ہیں اور یہ عقل والے ہی لوگ ہوتے ہیں جو اپنے اٹھنے، بیٹھنے اور اپنی کروٹوں میں برابر ذکرِ خدا کرتے رہتے ہیں ۔ اس کا مطلب یہی ہوا کہ اللہ کا ذکر کرنا اس بات کی علامت ہے

کہ ذکر کرنے والا عقل وفہم رکھتا ہے اور جو اس ذکر سے غافل ہے وہ عقل وفہم سے بھی خالی ہے۔

اس کے ساتھ ہی سورۂ اعراف کے آخر میں اس حقیقت کو بھی سمجھایا گیا ہے کہ ذکر اللہ صرف زبانی ذکر کرنے میں منحصر نہیں ہے بلکہ اس ذکر سے مراد دونوں طرح کے ذکر ہیں۔ زبانی بھی اور قلبی بھی چنانچہ ارشاد ہوا ہے :۲۱؎
وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِي نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيفَةً وَّدُونَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْآصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِينَ " یعنی تم اپنے پروردگار کو صبح وشام اپنے دل میں یاد کیا کرو عاجزی اور خوف کے ساتھ اور مناسب آواز کے ساتھ بھی نہ کہ چلّانے کی آواز سے اور تم غفلت کرنے والوں میں شامل نہ ہوجانا.

اس آیت میں صبح وشام سے مراد صرف دو ہی وقت نہیں ہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ ہمیشہ اللہ کو یاد کرتے رہو۔ غرض اس آیت سے یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ اللہ کا ذکر جس طرح زبان سے ہوتا ہے اسی طرح دل سے بھی ہوتا ہے اور در حقیقت ذکر تو وہی ہے جو دل سے ہو اور پوری طرح سمجھ کر کیا جائے ورنہ صرف زبان سے ذکر خدا کرنا جبکہ ذکر کرنے والے کا

دل اللہ کی یاد سے خالی ہو کوئی درجہ نہیں رکھتا بلکہ ایسی حالت میں جبکہ انسان کے دوسرے اعضاء حکمِ الٰہی کی خلاف ورزی اور نافرمانی میں مشغول ہوں نہ صرف یہ کہ ایسا زبانی ذکر بے سود ہے بلکہ بعض صورتوں میں ایسے ذکر سے توہینِ خدا پیدا ہو جائے گی جیسے معاذ اللہ کوئی بد کردار انسان زبان سے تو اللہ کا ذکر کرتا جائے اور ساتھ ہی چوری کا کام بھی کرتا رہے یا ملاوٹ کرتا رہے یا شراب پیتا رہے یا اسی طرح کے دوسرے بُرے کاموں میں مبتلا رہے۔ غرض ذکرِ الٰہی سے مراد وہ ذکر ہے جو سچّے دل سے ہو اور خوب سمجھ کر ہو یا کم از کم ایسا زبانی ذکر تو ہو جس کے ساتھ نافرمانی کا رخ موجود نہ ہو اس بنا پر ایسی دعائیں، استغفار اور ہر طرح کا زبانی ذکر بھی "ذکرِ خدا" سمجھا جائے گا جس میں دعا کرنے والا یا آیاتِ قرآنی کی تلاوت کرنے والا لفظوں کے تفصیلی معنی سے تو بے خبر ہو اور فقط اتنا سمجھتا ہو کہ میری زبان سے وہی لفظ ادا ہو رہے ہیں یا میں درگاہِ خداوندی میں وہی معروضات پیش کر رہا ہوں جنکو مجھے اپنے معبود اور اپنے خالق کے سامنے پیش کرنا

چاہیئے یا اس کی ایسی حمد و ثنا کر رہا ہوں جو بحیثیت اس کے عبد ہونے کے میری ذمہ داری ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ حقیقی اہل ایمان کی یہ علامت ہے کہ وہ کثرت سے ذکر خدا کرتے رہتے ہیں اور کسی وقت بھی وہ اس ذکر سے غافل نہیں رہتے اور اُن کے دل و زبان دونوں اللہ کی یاد میں مشغول رہا کرتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں سورۂ نور[۳] کے لفظوں میں نہ تجارت ذکر خدا سے روک سکتی ہے اور نہ کسی قسم کی بھی خرید و فروخت: رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ" اور یہی وہ لوگ ہیں جن کی طرف سورۂ منافقون میں اس طرح خطاب فرمایا گیا ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ" اے اہل ایمان تمہارے مال اور تمہاری اولاد کہیں تمکو ایسا نہ ہو کہ اللہ کے ذکر یعنی اس کی یاد سے غافل بنا دے کیونکہ جو لوگ ایسا کرتے ہیں وہی ہیں جو گھاٹے میں رہنے والے ہیں۔

لیلۃ القدر اور ماہِ رمضان
عظمت و برکت اور رحمت و سعادت کے لیل و نہار

روزہ اگر کسی کے دِل اور ضمیر کی تطہیر نہ کر سکے تو وہ حقیقی روزہ نہیں ہے۔ یعنی وہ روزہ کی صرف ایک صورت اور شکل ہے جس میں وہ روح نہ ہو جو اس کی اصلی غرض ہے۔ قرآنِ حکیم نے اسی لیے جہاں روزہ کا حکم بتایا ہے ساتھ ہی "لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ" "تاکہ تم پرہیزگاری اختیار کرو" فرما کر یہ بھی ظاہر کر دیا ہے کہ اسلامی روزہ صرف فاقہ کشی کا نام نہیں بلکہ اس میں پرہیزگاری اور تقویٰ کی روح ہوتی ہے دوسرے الفاظ میں روزہ اس کا سبب ہوتا ہے کہ انسان اس کی وجہ سے اپنے ضمیر میں ایک ایسی حالت اور کیفیت پیدا کر سکے جس کے بعد اس کو گناہوں سے نفرت اور نیکیوں کی طرف رغبت ہونے لگے۔ روزہ میں جہاں اور بڑے فائدے ہیں وہاں ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ وہ آپس کی محبت اور باہمی ہمدردی

کے جذبہ میں بے پناہ اضافہ کر دیتا ہے اور اگر یہ جذبہ نہیں ہے تو اسے پیدا کر دیتا ہے۔

یہ بات سب ہی جانتے ہیں کہ جبتک کسی پہ خود مصیبت اور تکلیف نہیں آتی اس وقت تک اسے دوسروں کی تکلیف کا احساس نہیں ہوتا اسی لیے جب کوئی روزہ رکھتا ہے تو اس کے دل میں ان بھوکوں کا بھی خیال آہی جاتا ہے جو زندگی کی سہولتوں سے محروم ہیں اور جو فقر و فاقہ میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس طرح روزہ اس شعور اور احساس کو جگاتا ہے اور دکھی انسانیت سے ہمدردی کے جذبہ کو بیدار کرتا ہے حضرت سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ایک مشہور خطبہ میں فرماتے ہیں: یہ مہینہ رحمتوں اور برکتوں کا ہے۔ مسلمانوں کے لیئے ضروری ہے کہ وہ خصوصیت کے ساتھ اس میں غریبوں اور ناداروں کی مدد کریں۔ بڑوں کا ادب کریں چھوٹوں پر نگاہِ کرم و عنایت رکھیں، اپنی زبانوں کو بُرے کلام اور خراب گفتگو سے محفوظ رکھیں، کانوں اور آنکھوں کو گناہ سے بچائیں، یتیموں پر رحم کریں اور اپنے گناہوں سے توبہ اور استغفار کریں۔ اس کے بعد ارشاد ہوا: جو شخص کسی دوسرے

مومن کا روزہ افطار کراتا ہے خدا اس کو ایک غلام آزاد کرنے کا ثواب عطا کرتا ہے اور اس کے گناہوں کو بخش دیتا ہے۔ یہ سن کر صحابۂ کرام نے عرض کی: حضورؐ! ہم میں بہت سے ایسے غریب اور مفلس لوگ ہیں جو اسقدر قدرت نہیں رکھتے کہ دوسروں کے لیئے افطاری کا اچھا سامان کر سکیں۔ آپ نے فرمایا: "وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ وَلَوْ بِشَرْبَةٍ مِّنْ مَاءٍ" اگر تم روزہ دار کو افطار کے لیئے کھجور کا صرف ایک ٹکڑا ہی دیدو یا پانی کا ایک گھونٹ ہی پلا دو جب بھی تمہیں یہی ثواب ملے گا کیونکہ ثواب تو دل کی نیت اور خلوص پر دیا جاتا ہے۔

آنحضرتؐ کا ارشاد ہے کہ جو شخص اس مہینہ میں لوگوں کے ساتھ ہمدردی اور حسن اخلاق کا برتاؤ کرتا ہے اس کے قدم پل صراط پر قیامت کے دن ڈگمگائیں گے نہیں اور وہ آسانی کے ساتھ اس پر سے گذر جائے گا۔

درحقیقت پورے سال میں یہی ایک ایسا مہینہ ہے جس میں اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے اور عمل کی تربیت حاصل کرنے کا بہترین موقع ملتا ہے۔ روزہ کا اصلی مقصد انسان کی جسمانی اور روحانی اصلاح ہے۔ اس کے لیئے ہمیں اس مقدس

اور متبرک مہینہ میں دو بڑے ذریعہ عطا کئے گئے ہیں - ایک قرآن کریم دوسرے یہی روزہ - روزہ ہماری روح کو بیدار کرتا ہے، ہمارے مردہ شعور میں حیاتِ تازہ بخشتا ہے اور ہمیں اس قابل بنا دیتا ہے کہ ہم قرآن پاک کی ہدایت سے فائدہ اٹھا سکیں، اس کے نور سے اپنے دل و دماغ کی تاریکیوں اور ضمیر کے اندھیروں کو مٹا کر اپنی زندگی میں غیر فانی تابناکیاں اجاگر کر سکیں، اپنے کردار کو دینِ مصطفوی کے نظام پر ڈھالنے کی سعی کریں اور اپنے بے حس ادراک کو اخوت و ہمدردی اور رحم و کرم کی امنگوں سے سرشار کر سکیں - روزہ رکھنے سے انسان میں جو صبر و شکر اور برداشت کی طاقت پیدا ہوتی ہے - وہ زندگی کی ہر راہ پر کام آتی ہے - غرض روزہ تربیت ہے - مصیبتوں پر صبر کرنے کی ! بھوک اور پیاس کی برداشت کرنے کی اور ایک کو دوسرے کے دکھ درد کا احساس دلانے کی ! امن و آرام سے زندگی بسر کرنے والے شہری ہوں یا میدان جنگ کے بہادر سپاہی، روزہ ہر مسلمان کو دوسرے کی مصیبت، بھوک اور پیاس کی تکلیف کا احساس دلاتا ہے اور اس میں قربانی اور باہمی ہمدردی کی وہ امنگ پیدا کر دیتا ہے جو کسی دوسرے

ذریعہ سے ممکن نہیں ہو سکتی۔ وہ تقدس اور پاکیزگی کی ایک ایسی کیفیت پیدا کرتا ہے جو روزہ دار کے پورے شعور پر چھا جاتی ہے اور سحر کے ابتدائی اجالے سے لیکر شام کے اندھیرے تک بندہ اور اس کے اللہ میں ایک عجیب سا ربط ہو جاتا ہے جو کسی اور طرح ممکن نہیں ہوتا۔

بلا شبہ روزہ کا یہی تقاضہ ہے کہ ہم اپنے آپ کو گناہوں سے محفوظ رکھیں۔ اُس روزہ میں ہرگز اسلامی روح نہ ہوگی جس میں گناہوں سے پرہیز نہ ہو، وہ لوگ بڑے بدقسمت ہیں جو اس مقدس مہینہ میں اس کی عظیم برکتوں سے صرف محروم ہی نہیں رہا کرتے بلکہ اپنے ضمیر کو اور زیادہ پستی اور تاریکی میں پہنچا دیتے ہیں۔ ملاوٹ کرنا، ناجائز نفع لینا، جھوٹ بولنا، چوری کرنا، دوسرے کو زبان یا ہاتھ سے اذیت دینا بدکاریاں کرنا، فریب اور دھوکا دینا اور اسی طرح کی دوسری باتیں یوں بھی گناہ ہیں پھر ماہ رمضان میں ان گناہوں کی شدت اور بڑھ جاتی ہے۔ اس بنا پر ہر مسلمان کے لیئے ضروری ہے کہ وہ اپنے ضمیر کو پاک رکھے اور اس مقدس مہینہ کی عظمت کا پورا لحاظ رکھے۔

زمانہ کے انقلابات روزانہ ہمارے لیئے عبرت کا سامان لاتے رہتے ہیں اور کچھ بعید نہیں کہ کبھی ہم بھی دوسروں کیلیئے عبرت بن جائیں اس لیئے ہمارا فرض ہے کہ ہم اس اللہ کے غضب اور قہر سے ڈریں جو ہماری بداعمالیوں سے پوری طرح واقف اور باخبر ہے اس سے ہماری کوئی بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ آج کے مصائب اور آفتیں آخری نہیں ہیں وہ کل بھی آسکتی ہیں حضرت امیرالمومنین علی بن ابی طالب علیہ السلام نے فرمایا ہے۔ "اللہ سے جنگ نہ کرو کیونکہ تم نہ تو اس کے قہر و غضب کا مقابلہ کر سکتے ہو اور نہ اسکی رحمت سے بے نیاز ہو سکتے ہو۔ حضرت علیؑ کے اس ارشاد میں کتنی گہرائی ہے! بے شک ضعیف اور بے بس انسان خدا سے مقابلہ نہیں کر سکتا اور اس کے لیئے بس یہی ایک راستہ ہے کہ وہ ہر فرمانِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم جھکا دے وہ اگر اللہ کو چھوڑ کر جانا چاہے گا تو اس کی خدائی سے نکل کر کدھر جائے گا!۔

ہر مسلمان کیلیئے لازم ہے کہ وہ اس بابرکت مہینہ سے فائدہ اٹھائے اور خدا کے سامنے اپنی فردِ عمل کو صحیح کرے۔ اس میں وہ جس قدر رحمتِ الٰہی سے فائدہ اٹھا سکتا ہے دوسرے زمانہ میں

نہیں اٹھا سکتا جب تک پھر یہی مبارک مہینہ نہ آجائے اس عظیم مہینہ کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں شب قدر بھی ہے۔ یہ وہ مبارک رات ہے جس میں قرآن کریم کا نزول ہوا اور رسولِ اکرم کے ذریعہ سے ساری انسانیت کو وہ الٰہی قانون حاصل ہوا جو قیامت تک کے لئے آخری ہے۔ اللہ نے شب قدر کو ایسے ایک ہزار مہینوں سے افضل اور بہتر کہا ہے۔ جن میں کوئی شب قدر موجود نہ ہو۔ اس بات میں بہت سے قول ہیں کہ شب قدر کونسی رات ہے۔ اور کس مہینہ کی رات ہے۔ مگر زیادہ تر محدثین و مفسرین اسی طرف گئے ہیں کہ یہ مبارک رات رمضان ہی میں ہے اور خدا کے اس ارشاد سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے کہ قرآن کو ماہ رمضان میں نازل کیا گیا ہے "شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْآنُ (بقرہ ۱۸۵) دوسری جگہ یہ بھی فرمایا گیا ہے کہ "اِنَّا اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ (القدر) یعنی ہم نے قرآن کو شبِ قدر میں نازل کیا ہے۔ جب ان دونوں آیتوں کے مفہوم کو ملا کر دیکھا جاتا ہے تو یہ بات صاف طریقہ پر سمجھ میں آجاتی ہے کہ شب قدر رمضان ہی میں ہے۔

اس مسئلہ میں بھی کئی قول ہیں کہ لیلۃ القدر ماہ رمضان کی کس رات کا نام ہے مگر زیادہ تر لوگ اسی کے قائل ہیں کہ یہ رات

رمضان کے آخری دس دنوں میں ہے اور یہ اکائی کی رات ہے یعنی اکیسویں، تیئیسویں، پچیسویں، ستائیسویں یا انتیسویں راتوں میں سے کوئی ایک رات مراد ہے۔

غرض اصلی شب قدر کو ان راتوں میں پوشیدہ کر دیا گیا ہے، تاکہ لوگ اس رات کی عظیم فضیلت اور ثواب کو حاصل کرنے کے لیئے ہر شب میں عبادت کرتے رہیں اور زیادہ سے زیادہ ثواب حاصل کریں۔ ایک حدیث میں سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے۔ جو شخص شب قدر میں ایمانداری اور خلوص نیت کیساتھ خدا کی عبادت کرتا ہے اسکے پچھلے گناہ بخش دیئے جاتے ہیں۔ مگر اسکا مطلب یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ لوگ اطمینان سے گناہ کرتے رہیں اور یہ سمجھ لیں کہ جب شب قدر آئے گی تو سب گناہ بخشوا لیں گے۔ درحقیقت گناہ صرف ان لوگوں کے بخشے جائیں گے جو اپنے گناہوں پر دل سے نادم اور پشیمان ہوں اور یہ طے کر لیں کہ آئندہ کوئی گناہ نہ کریں گے۔ اللہم سب مسلمانوں کو اس عظیم رات کی برکتوں سے فائدہ اٹھانے کی توفیق عطا کرے اور ہمیں اپنے فرماں بردار بندوں میں شمار کر لے۔

روزہ اور تزکیۂ نفس

حضرت عیسیٰ بن مریم علیہما السّلام کا قول ہے کہ نفسِ انسانی کی برائیاں دور کرنے اور اسے پاک و پاکیزہ بنانے کے دو۲ ذریعے ہیں ایک روزہ دوسرے نماز۔ اگر پورے خلوص اور سچے دل سے نماز پڑھی جائے اور اُس پر پابندی کی جائے اسی طرح پوری شرطوں کے ساتھ روزہ رکھا جائے تو انسان کا ضمیر برائیوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ نفس کی اسی صفائی کا نام تقویٰ اور تزکیہ ہے۔ اسی تطہیرِ نفس کی اہم ترین غرض کی طرف سورۂ بقرہ کی اُس آیۂ کریمہ میں اشارہ فرمایا گیا ہے جو "کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ" کے جملہ سے شروع ہوتی ہے۔ یہ بات جو حضرت عیسیٰ علیہ السّلام نے فرمائی تھی اس کا تعلق تو عام روزہ کی غرض اور فائدہ سے تھا لیکن ماہ رمضان کے روزوں میں یہ فائدہ زیادہ اہمیت کے ساتھ سامنے آتا ہے اس لیئے اس میں روزوں کے تسلسل کی وجہ

سے نفس کی تطہیر اور صفائی کا ایک مہینے تک برابر موقع ملتا رہتا ہے یعنی اگر ایک روز اس تطہیر کے مقصد میں کوئی کمی رہجاتی ہے تو دوسرے دن یا دوسرے دنوں میں اس کی تکمیل ہو جاتی ہے۔ البتہ یہ بات ہمیں پوری طرح یاد رکھنا چاہیئے کہ تطہیر اور تزکیۂ نفس کا فائدہ ہمیں ان ہی روزوں سے حاصل ہو سکتا ہے جو حقیقی روزے ہیں اور وہ پوری شرطوں کے ساتھ رکھے جائیں کیونکہ صرف فاقہ کر لینے اور بھوکا اور پیاسا رہنے کا نام روزہ نہیں ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا ہے: مَنْ صَامَ شَہْرَ رَمَضَانَ فِی الْاِنْصَاتِ وَسُکُوْتٍ وَکَفَّ سَمْعِہٖ وَبَصَرِہٖ وَلِسَانِہٖ وَیَدِہٖ وَجَوَارِحِہٖ مِنَ الْحَرَامِ وَالْکِذْبِ وَالْغِیْبَۃِ وَالْاَذٰی قُرِّبَ مِنَ اللّٰہِ جَلَّ ثَنَاءُہٗ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ حَتّٰی تَمَسَّ رُکْبَتَہٗ اِبْرَاہِیْمَ عَلَیْہِ السَّلَامُ۔ جو شخص ماہِ رمضان میں پورے سکون و اخلاص و وقار کے ساتھ روزے رکھے اور اپنے کانوں، زبان اور ہاتھوں اور تمام اعضاء بدن کو حرام باتوں سے، جھوٹ بولنے اور کسی کے پیٹھ پیچھے برائی کرنے اور لوگوں کو اذیت پہنچانے سے باز رہے، اس کا مرتبہ قیامت کے روز بہت بڑا ہوگا یہاں تک کہ وہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ

علیہ السلام سے بہت نزدیک ہوجائیگا۔

ایک دوسری حدیث میں حضورؐ نے فرمایا ہے :

"اِذَا صُمْتَ فَلْیَصُمْ سَمْعُکَ وَبَصَرُکَ وَلَا یَکُوْنَنَّ یَوْمُ صَوْمِکَ کَیَوْمِ فِطْرِکَ"۔ جب روزہ رکھو تو ضروری ہے کہ تمہارے کان اور آنکھیں بھی روزے سے ہوں اور تمہارے روزے کا دن ایسا نہ ہو جیسا وہ دن ہوتا ہے جب تم روزے سے نہیں ہوتے ہو۔ مقصود یہ ہے کہ روزہ رکھنے والے کے لیئے ضروری ہے کہ روزہ اُن شرطوں کے ساتھ رکھے جو شریعت نے معیّن کردی ہیں اور اُن باتوں کا ارتکاب نہ کرے جو ممنوع ہیں خواہ وہ ایسی ہوں جو ہر حالت میں ممنوع ہوں یا صرف روزے کی حالت میں ممنوع قرار دی گئی ہوں تاکہ اس سے نفس میں اطاعتِ خداوندی کا جذبہ بیدار ہو، تقرّبِ الٰہی کی جستجو کا شوق دل میں ابھرے اور انسان کا ضمیر عام برائیوں سے پاک صاف ہوسکے۔ غرض روزہ نفس کی تطہیر کا ایک بڑا مؤثر ذریعہ ہے جس سے انسان اپنی نفسانی خواہشات کو عقل و شریعت کے تابع بنا سکتا ہے۔ اور ایمان و تقویٰ کی اُن عظیم صلاحیتوں کو پیدا کرسکتا ہے، جنکے بغیر دنیوی اور اُخروی فلاح و نجات نہیں ہوسکتی جسے دوسرے لفظوں میں ہم تزکیۂ نفس کہتے ہیں۔

فطرے کی اہمیّت

فطرہ ادا کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے اور احادیث میں اسے روزوں کی قبولیت کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ زکوٰۃ فطر ۲ھ میں فرض کی گئی تھی جس کے بعد ہمیشہ کے لیئے اس کا ادا کرنا ہر مسلمان پر شرعی قواعد اور شرطوں کے مطابق فرض ہو گیا ہے۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے زکوٰۃ فطرہ ادا کرنے کی بہت تاکید فرمائی ہے اور فرمایا ہے کہ جو مسلمان فطرہ ادا کرتا ہے تو اللہ سال بھر کے لیئے موت کو اُس سے دفع کر دیتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بات بھی معلوم رہنا چاہیئے کہ ایسا ہرگز نہیں ہے کہ جو شخص روزے رکھے صرف اسی پر فطرہ ادا کرنا فرض ہو اور جو نہ رکھے اُس پر فرض نہ ہو بلکہ یہ ہر مسلمان پر فرض ہے خواہ اس نے روزے رکھے ہوں یا نہ رکھے ہوں۔ زکوٰۃ فطرہ کو صدقۂ فطر بھی کہتے ہیں۔

دونوں کا مطلب ایک ہی ہے۔ زکوٰۃ یا صَدَقۂ فطر خود اپنی طرف سے اور ان تمام لوگوں کی طرف سے جو زیرِ کَفَالَت و زیرِ پرورش ہوں ادا کرنا ہوگا۔ اس کا ادا کرنا ان لوگوں پر فرض ہوتا ہے جو شرعی اصطلاح میں محتاج نہ ہوں۔ بعض نے کہا ہے کہ وہ ایسے لوگ ہوں جن کے پاس اُن کے ضروری اخراجات کے علاوہ اس قدر سامان موجود ہو جس کی مقدار نصابِ زکوٰۃ کے برابر ہو اور کچھ علماء کہتے ہیں کہ اس کے وجوب میں فقط اتنا ہی کافی ہے کہ سال بھر کے اخراجات کا سہارا موجود ہو۔ شوال کا چاند ہوتے ہی زکوٰۃِ فطر کا ادا کرنا فرض ہو جاتا ہے جیسے نمازِ عید سے پہلے ہی ادا کر دینا چاہیئے۔ سرکارِ دو عالم نے فرمایا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ جس شخص نے نمازِ عید سے قبل فطرہ ادا کر دیا اس کا یہ عمل درجۂ قبولیت حاصل کرے گا۔

فطرہ کی اہمیّت کے بہت سے پہلو ہیں۔ اس سے غریب و نادار طبقہ کی بہت سی حاجتیں کبھی پوری ہو جاتی ہیں۔ اور خود پیسہ والوں کے دلوں میں غریبوں کی تکلیف

اور اُن کے دکھ درد کا احساس بھی ابھرتا ہے اور انھیں اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ کون کون لوگ امداد لینے کے حقدار ہیں اس کے علاوہ آپس میں امیروں، غریبوں اور چھوٹے بڑوں کے درمیان اخوت و ہمدردی اور اسلامی برادری کا جذبہ اجاگر ہوتا ہے ساتھ ہی روزے میں جو کوتاہی ہو گئی ہو وہ بھی دور ہو جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ بھی معلوم ہونا چاہیئے کہ جو لوگ اصطلاحِ شریعت کی بنیاد پر فقیر و محتاج کیے جاتے ہیں اُن سے صدقۂ فطر کی ادائیگی ساقط ہے لیکن اگر وہ کسی نہ کسی صورت سے اس کو ادا کر دیں تو انھیں بھی اس کا ثواب ضرور حاصل ہو گا۔ رہا زکوٰۃِ فطر کا مَصرَف یعنی یہ کس کو دی جائے تو جو آٹھ مصارف اسلام نے عام زکوٰۃِ مال کے مقرر کیئے ہیں وہی اس کے بھی مصارف ہیں جن کا قرآنِ پاک میں تفصیل سے ذکر موجود ہے۔ ان آٹھ مصارف میں "فی سبیل اللہ" کا مصرف بھی ہے جس میں وہ تمام باتیں شامل ہیں جو تقرّبِ الٰہی کا سبب اور وسیلہ بن سکیں۔ یہی تمام مصارف زکوٰۃ فطر کے بھی ہیں البتہ رشتہ دار فقراء و مساکین بہر حال میں مقدّم ہیں ایک آدمی

ایک فطرہ کئی مستحقوں کو بھی تھوڑا تھوڑا دیا جا سکتا ہے اور اس کی کل مقدار ایک ہی شخص کو بھی ادا کر سکتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ کئی آدمی اپنے اپنے فطرے ایک ہی آدمی کو دیدیں مگر اس حد تک کہ وہ محتاج شخص شرعاً "غنی" نہ کہلائے اور محتاج کی شرعی اصطلاح سے خارج نہ ہو جائے کیونکہ اس کے بعد پھر اسے فطرہ دینا جائز نہ ہو گا۔ فطرہ میں غلّہ کے بجائے اس کی قیمت بھی دی جا سکتی ہے۔ جو لوگ عیال میں داخل ہوں اور ان کا نفقہ واجب ہو انھیں فطرہ نہیں دیا جا سکتا۔ اس کو ملازمین کی تنخواہوں میں حساب نہیں کیا جا سکتا۔ فقہ حنفی میں سادات کو زکواۃِ فطر نہیں دی جا سکتی مگر فقہ جعفری میں اگر زکواۃِ فطر سادات کی ہو تو اسے سادات لے سکتے ہیں۔ غیر سادات کی زکوٰۃ سادات نہیں پا سکتے۔

فقہ حنفی کے مطابق ایک شخص کو احتیاطاً دو سیر گیہوں یا آٹا یا اس کی قیمت ادا کرنا چاہئے اس گیہوں یا آٹے سے مراد اس کی وہ قسم ہے جو عام طور پر استعمال کی جاتی ہو۔

مگر فقہِ جعفری میں ایک فطرے میں احتیاطاً ساڑھے تین سیر گیہوں یا آٹا۔ یا اس کی قیمت ادا کرنا چاہیئے جو اس کی اُس قسم کے ریٹ کے مطابق ہو جسے عام طور پر سب استعمال کرتے ہوں۔

اللہ ہم سب مسلمانوں کو احکامِ خداوندی پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

حصولِ علم میں دیانت

اسلام کے نزدیک حصولِ علم کا جو مرتبہ ہے وہ اسی سے ظاہر ہے کہ قرآنِ کریم کا وہ سورہ جو سب سے پہلے نازل ہوا تھا علم ہی کے ذکر پر مشتمل ہے۔ ارشاد ہوتا ہے: اِقْرَأْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِي خَلَقَ ۝ خَلَقَ الْإِنسَانَ مِنْ عَلَقٍ ۝ اقْرَأْ وَرَبُّكَ الْأَكْرَمُ ۝ الَّذِي عَلَّمَ بِالْقَلَمِ ۝ عَلَّمَ الْإِنسَانَ مَا لَمْ يَعْلَمْ ۝ (پارہ ۳۰ رکوع ۲۱) اے رسولؐ اپنے پروردگار کا نام لیکر پڑھو جس نے ہر چیز کو پیدا کیا، اسی نے انسان کو جمے ہوئے خون سے خلق کیا، پڑھو اور تمہارا پروردگار بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعہ سے تعلیم دی، اسی نے انسان کو ان چیزوں کی تعلیم دی جن کو وہ نہیں جانتا تھا۔ یہ وحی قرآنی کے پہلے جملے ہیں جن میں علم کی اہمیت پر انسان کو توجہ دلائی جا رہی ہے اور سب سے پہلا لفظ جو بولا گیا ہے وہ وہی ہے جس کے معنی پڑھنے کے ہیں۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ علم کی تحصیل اسلام کا سب سے اہم مقصد ہے جس پر اسلام کی تمام تعلیموں کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔

علم کی اہمیت کی طرف دوسرے مقام پر قرآن کریم میں یہ الفاظ ارشاد ہوئے ہیں۔ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ۔ (پارہ ۲۳ رکوع ۱۵) اے رسول لوگوں سے پوچھو کہ علم رکھنے والے اور جاہل کیا دونوں برابر ہیں؟ یعنی یہ دونوں آپس میں برابر نہیں ہیں بلکہ علم رکھنے والے جاہلوں پر بڑی فضیلت رکھتے ہیں۔

قرآن کریم میں سوائے لفظ "اللہ" کے "علم" کے لفظ سے زیادہ تکرار کسی دوسرے لفظ کی نہیں ہے جس سے اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام کے نزدیک علم کا کیا مرتبہ ہے۔ اس طرح یہ کہنا بالکل صحیح ہو گا کہ اسلام علم وعقل کے دین ہی کا نام ہے، اور ایک ایسے طرز زندگی کا نام ہے جس کی بنیاد علم پر قائم ہے۔ اور اسی وجہ سے حدیث میں بھی فرمایا گیا ہے: "اَلْعِلْمُ حَيَاةُ الْاِسْلَامِ وَعِمَادُ الدِّيْنِ" علم اسلام کی زندگی اور دین کا ستون ہے۔ اس سے زیادہ علم حاصل کرنے کی اہمیت اور ضرورت کو کسی دوسری عبارت سے نہیں سمجھایا جا سکتا جس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ اگر علم کو اسلام سے الگ کر دیا جائے تو اس میں کوئی زندگی باقی نہیں رہتی لیکن اب دیکھنا یہ ہے کہ علم سے مراد کیا ہے اور اسلام کے نزدیک تحصیل علم کا طریقہ کیا ہے اور پھر علم حاصل کرنے والے کے فرائض کیا ہوتے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ

جب کبھی قرآن اور حدیث میں علم کا لفظ لایا جاتا ہے تو اس سے مراد وہ علم ہوتا ہے جو انسان کے لیئے دنیا اور آخرت کی نیکیوں کے حصول کا ذریعہ ہو اور جس کے ذریعہ اس کی خلقت کی غرض پوری ہوتی ہو۔ جو اسے اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کی صلاحیت دے سکے اور اس کے اپنے مقام اور فرائض کو بتا سکے۔ انسان اور حیوان میں یہی فرق ہے کہ انسان کو علم حاصل کرنے کی قوت عطا ہوئی ہے جو حیوان کو نہیں دی گئی اس لیے انسان کو اپنا اصلی مرتبہ اسی وقت مل سکتا ہے جب وہ علم حاصل کرے اور علم کا حصول صرف اس کے حصول کی حد تک تو کوئی معنی نہیں رکھتا جب تک اس علم پر عمل نہ کیا جائے اور اس سے جو صحیح فائدہ ممکن ہے وہ خود علم حاصل کرنے والا بھی اٹھائے اور اس فائدہ کو دوسروں تک بھی پہنچائے ورنہ ایسا علم کس کام کا جو صرف کتابوں تک محدود رہے یا محض دماغوں میں بند رہے اور اس سے نہ اپنی ذات کو کوئی فائدہ پہنچے اور نہ دوسروں کو۔

اس کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ علم کے بغیر انسان کی نہ کوئی قیمت ہے اور نہ اس کا کوئی مقام ہے اور اس علم کے حاصل کرنے میں اور اس کو دوسروں تک پہنچانے میں انسان کا فرض ہے کہ

پوری امانت اور دیانت سے کام لے۔ اللہ نے انسان کو کائنات پر برتری کی عزت دی اور قرآن مجید نے اس کا اعلان کیا ہے کہ سَخَّرَ لَكُم مَّا فِي السَّمٰوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ (لقمان/۲۰) جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے سب کا سب ہم نے تمہارے لئے مسخر کر دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ زمین و آسمان کی ہر چیز انسان کے لیے بنائی گئی ہے اور جب ایسا ہے تو پھر انسان کا یہ فرض ہے کہ وہ کائنات کی چیزوں کا علم حاصل کرے اور وہ تمام علوم سیکھے جن سے وہ اپنی شخصیت کی تعمیر کر سکے اور اپنی زندگی کے تمام مفید پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے قابل ہو جائے۔ علم کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ آدمی اُن باتوں کو معلوم کر لیتا ہے جو اس کے لیئے اچھی ہیں یا بُری ہیں اور پھر وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ بری باتوں سے بچ سکے اور اچھائیوں کو حاصل کر سکے۔ یہ علم انسان کے پاس اللہ کی ایک امانت ہے جس کی پوری دیانت کے ساتھ حفاظت کرنا اور امانتداری کے ساتھ اسکو معاشرے کے دوسرے افراد تک پہنچانا انسان کا فرض ہے اگر اس فرض کو پورا کرنے میں ذرا سی بھی خیانت کی گئی تو اس سے پورا انسانی معاشرہ متاثر ہو سکتا ہے اور اس کے بعد جتنی خرابیاں

پیدا ہونگی ان سب کی ذمہ داری اس شخص پر ہوگی جس نے حصول علم میں دیانت سے کام نہیں لیا، اس کو دوسروں تک پہنچانے میں خیانت کی اور اپنے فرض کو ادا کرنے میں کوتاہی سے کام لیا۔ ایک حدیث میں یہ الفاظ ہیں: "وَيْلٌ لِأُمَّتِي مِنْ عُلَمَاءِ السُّوْءِ" برے عالموں کی وجہ سے میری امت پر افسوس ہے لفظ "ویل" "افسوس" برائی، خرابی اور تباہی کے لیئے بولا جاتا ہے اس لئے سرورؐ کائنات کی مراد یہ ہے کہ امت مسلمہ کی تخریب اُن لوگوں کی وجہ سے ہوگی جو بُرے علم والے ہوں گے یعنی وہ اپنے علم کو غلط طریقوں سے حاصل کریں گے اور ناجائز مقاصد کے لیئے صرف کریں گے ایسے علم رکھنے والے "علماء سُوء" ہیں اور امت کی تباہی کا سبب ہیں۔

اس لیئے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ تحصیل علم اور تقسیم علم یعنی علم سے کام لینے میں پوری دیانت اختیار کرے اور علم کو اس لیئے حاصل کرے کہ وہ ایک شرف اور عزت ہے اور پوری امانت کے ساتھ اس دولت کو دوسروں تک پہنچائے۔ اسی دولت سے دین اور دنیا کی تمام بلندیاں حاصل ہوسکتی ہیں۔ اسی سے فرد اور معاشرہ دونوں کی تعمیر ہوتی ہے اور اس دولت و نعمت کے

حصول میں اور دوسروں تک پہنچانے میں چھوٹی سے چھوٹی بد دیانتی سارے انسانی معاشرے کو مصیبت میں مبتلا کر سکتی ہے اور اس ایک غلطی سے ہماری آنے والی نسلوں کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے اس لیئے یہ بات لازمی ہے کہ حصولِ علم میں بد دیانتی کا ذرا سا بھی پہلو نہ آنے پائے اور جبکہ حدیث میں سرورِ دو عالم کا یہ ارشاد موجود ہے کہ علم دین کا ستون اور اسلام کی زندگی ہے تو ہر طالبِ علم کا یہ فرض ہے کہ وہ اسلام کی اس حیات اور دین کے اس رکن اور ستون کے ساتھ پوری امانت داری اور دیانت کا ثبوت دے۔ ظاہر ہے کہ ہمارے ملک اور ملّت کا کوئی کام خواہ وہ کسی ادارے سے متعلق ہو یا کسی ذات سے، بغیر علم کی تحصیل کے پورا نہیں ہو سکتا۔ علم رکھنے والے ہی ملک و ملّت کے معمار ہوا کرتے ہیں، طلّابِ علم ہی کے ہاتھوں میں ملکوں اور قوموں کی قسمت ہوا کرتی ہے تو اگر یہ اہم ترین جماعت جس سے قوم و ملک کی ترقی، نیک نامی اور زندگی وابستہ ہے اپنے فرائض کا احساس نہ کرے اور اپنے علم و فن کو بجائے تعمیر کے ملک و ملّت کی تخریب میں لگا دے تو اس کے متعلق قرآن و حدیث کا فیصلہ پوری طرح ظاہر ہے اور یقینی طور پر اس کمزوری سے ملک و قوم کا

کو بدترین نتیجوں سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اس لیئے ہمارے محترم طلبہ، معلمین اور تمام علم و فن والوں کا فرض ہے کہ وہ وعظ و تبلیغ میں، دفتروں کی کارکردگی میں، عدالتوں کے کاموں میں، صنعت و حرفت کے شعبوں میں، ملکی دفاع کے میدانوں میں اور اپنے گھروں یا اسکولوں اور کالجوں کے ماحول میں غرض ہر شعبۂ زندگی میں خواہ وہ انفرادی ہو یا اجتماعی، پوری دیانت کے ساتھ اپنے فرائض کو پورا کریں اور اس بات کا لحاظ رکھیں کہ اسلام کی طرف سے حصول علم کے سلسلہ میں اُن میں سے ہر ہر فرد پر بھاری ذمہ داری کا بوجھ ہے جس کو پورا کرنا اور پوری دیانت و امانت کے ساتھ انجام دینا ان کا فرض ہے اور ان کے ہر عمل اور ہر قدم سے قوم و ملک کا وقار، زندگی اور عزت و ترقی وابستہ ہے۔

حاجت مندوں کے حقوق

کوئی شخص بھی ایسا نہیں ہے جو کسی نہ کسی صورت میں معاشرہ کے افراد کی مدد کا محتاج نہ ہو کیونکہ انسان اپنی خلقت اور فطرت کے اعتبار سے "مدنی الطبع" ہے یعنی اس کی زندگی آپس کے میل جول اور ایک دوسرے کی مدد پر قائم ہے اور جب تک یہ باہمی تعاون نہ ہوگا وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ رہنے سہنے، کھانے پینے، پہننے اوڑھنے، ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے میں، لکھنے پڑھنے میں غرض زندگی کی بیشتر ضرورتوں میں ہمارے ہر قدم پر یہ احتیاج پائی جاتی ہے، امیر ہوں یا غریب ہوں، حاکم ہوں یا محکوم ہوں، چھوٹے ہوں یا بڑے ہوں اس قسم کی عام احتیاج سے کوئی بھی بچ نہیں سکتا۔

لیکن کبھی یہ احتیاج زیادہ بڑھ جاتی ہے اور نہ صرف وسائل زندگی کو کام میں لانے کے لیے بلکہ خود ان وسیلوں کے حاصل کرنے ہی میں آدمی دوسروں کی مدد کا محتاج ہو جاتا ہے۔ ایسے

ہی لوگوں کو عام طور پر حاجت مند کہا جاتا ہے۔ اس قسم کی احتیاج بھی اکثر و بیشتر لوگوں کو زندگی کے کسی نہ کسی مرحلہ پہ پیش آہی جاتی ہے اور وہ اس احتیاج اور مصیبت کے وقت دوسرے لوگوں سے امداد لینے پہ مجبور ہو جاتے ہیں۔ اس بنا پر ہر شخص کے لیے ضروری ہے کہ وہ جہاں تک بھی اس کیلئے ممکن ہو مصیبت زدہ لوگوں کی امداد کرنے کی کوشش کرے اور اپنی موجودہ بہتر حالت کے سامنے ان کو حقیر و ذلیل نہ سمجھے کیونکہ یہ پوری طرح ممکن ہے کہ آج جس صورت سے ایک محتاج اور مصیبت کا مارا ہوا انسان ایک خوشحال آدمی سے مدد کا سوال کر رہا ہے کل وہ آدمی خود اس سے زیادہ بُری حالت میں دوسروں کے سامنے اُن سے امداد کی بھیک مانگنے پر مجبور ہو جائے۔ زمانہ کی یہ کروٹیں اور حالات کے پلٹا کھانے کے یہ نقشے ہم برابر دیکھتے ہی رہتے ہیں مگر ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم ان باتوں کو عبرت کی نگاہ سے دیکھیں، ان میں غور و فکر سے پوری طرح کام لیں اور کچھ سبق حاصل کریں۔ قرآنِ پاک نے ہمیں طرح طرح سے ان حقیقتوں کو سمجھنے کی طرف توجہ دلائی ہے تاکہ ہم میں باہمی تعاون کا جذبہ پیدا ہو اور ہمارا معاشرہ ترقی کر سکے

سورۃ الضحٰی میں ارشاد ہوتا ہے: وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ "
اور سوال کرنے والوں کو جھڑکا نہ کرو۔ علامہ طبرسی اور دوسروں
نے لکھا ہے کہ یہاں مراد یہ ہے کہ ہر ضرورت مند اور حاجتمند
جو تم سے کسی قسم کی مدد طلب کرے چاہے وہ جسمانی ہو،
علم و فن سے تعلق رکھتی ہو یا مال و دولت سے، اُس محتاج کی
امداد کرنا تمہارے لیئے ضروری ہے اور ایسے تمام لوگ "سائل"
کے لفظ کا مصداق ہیں۔ یعنی کسی سوال کرنے والے کو بھی
جھڑک کر رد نہ کرو بلکہ اپنے مقدور بھر اس کی حاجت کو پورا
کرنے کی کوشش کرو اور اگر نہ کر سکو تو نرمی اور خوبصورتی اور
حُسنِ اخلاق کے ساتھ عذر پیش کر دو۔ دوسری جگہ اس طرح
فرمایا گیا ہے:

وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ "
(المعارج - ۲۶)

اور جن (مسلمانوں) کے مال میں مانگنے والوں اور نہ مانگنے والوں
کے لیئے مقرر حق ہے۔ سورۃ الذّاریات میں بھی اسی طرح
کا ارشاد ہوا ہے وہاں "معلوم" کا لفظ نہیں ہے جس کے
معنی مقررہ اور معین کے ہیں اور عام طریقہ پر فرمایا گیا ہے کہ

(مسلمانوں) کے مال میں مانگنے والوں اور نہ مانگنے والے (حاجتمندوں) کے لیئے حق یعنی حصّہ ہے۔ غرض ہمارے معاشرہ کے حاجتمندوں اور مصیبت زدہ لوگوں کے ہم پر ہر طرح کے حقوق ہیں جن کا ہمارے خوشحال لوگوں کو خیال رکھنا چاہیئے اور ان کی مدد کر کے اپنے انسانی فرض کو ادا کر لے اور خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کی پوری کوشش کرنا چاہیئے یہ حقوق کچھ تو ایسے ہیں جو شریعت کی جانب سے فرض کر دیئے گئے ہیں جیسے زکواۃ وغیرہ اور کچھ وہ ہیں جنہیں ادا کرنا ہماری مرضی پر چھوڑ دیا گیا ہے لیکن ساتھ ہی اس دنیا اور آخرت میں جو کچھ نفع اور فائدہ ہے اس کو بھی پوری طرح سمجھا دیا گیا ہے۔

مدد کرنے کے جو طریقے ممکن ہیں ان میں سے ایک صورت یہ بھی ہے کہ اگر کوئی شخص خود کسی کی مدد نہیں کر سکتا اور اس کے ذاتی حالات اس کی اجازت نہیں دیتے لیکن وہ سفارش کر کے کسی دوسرے شخص سے امداد حاصل کرنے کا وسیلہ بن سکتا ہے تو اس طرح کی سفارش اور کوشش بھی اس کی امداد ہی سمجھی جائے گی۔ قرآن کریم میں اس قسم کی امداد

کے لیئے بھی ہدایت فرمائی گئی ہے۔

اس باہمی تعاون یا ضرورتمند لوگوں کی امداد کے جذبہ کو اُبھارنے کے لیئے ہی قرآن حکیم نے اس کے ایک دوسرے ضروری پہلو کو بھی سمجھا دیا ہے جس میں امداد کرنے کے بجائے مدد نہ کرنے کا حکم ہے۔ کیونکہ وہاں امداد کا نتیجہ انفرادی یا اجتماعی تباہی اور بربادی ہوتا ہے اور وہ ہے ایسی امداد اور ایسا تعاون جو گناہ اور بُرے کاموں کے لیئے ہو اور جس سے معاشرہ میں خرابیاں پیدا ہوتی ہوں یا ان کو قوت ملتی ہو، ارشاد ہوتا ہے: وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ وَاتَّقُوا اللّٰهَ (مائدۃ ۲) یعنی نیکی اور پرہیزگاری کے کاموں میں تو ایک دوسرے کی مدد کیا کرو مگر گناہ اور ظلم کے کاموں میں ایک دوسرے کے مددگار نہ بنو اور خدا سے ڈرتے رہو، نتیجہ یہ نکلا کہ اگر ہم کو اس کا یقین ہو کہ ہماری اس مدد سے گناہوں کے کاموں میں اضافہ ہوگا یا کسی طرح بھی اس سے ناجائز مقصد حاصل کیا جائے گا تو اس یقین کے بعد ہمارے لیئے ایسی مدد کرنا کسی طرح بھی درست اور جائز نہ ہوگا۔ خلاصہ یہ ہوا کہ حاجتمندوں اور ضرورتمندوں کی

ہر قسم کی جائز امداد اور جائز اعانت کرنا مسلمانوں کی زندگی کا ایک بنیادی امتیاز ہے ۔ اور یہ وہ ضروری اور اہم پہلو ہے جس میں اسلامی معاشرہ کی ترقی اور فلاح پوشیدہ ہے ۔
حدیثِ رسولؐ میں ارشاد ہوا ہے : کہ جو شخص اپنے بھائی کی حاجت پوری کرنے میں لگا رہے گا اور جو مسلمان دوسرے مسلمان کی کسی مصیبت کو دور کرے گا تو اللہ قیامت کی مصیبتوں میں سے کسی مصیبت کو اس سے دور فرمائے گا ۔ (صحیحین)
ایک دوسری حدیث رسولؐ میں یہ الفاظ ہیں : وَاللّٰہُ فِیْ عَوْنِ عَبْدِہٖ مَا کَانَ الْعَبْدُ فِیْ عَوْنِ اَخِیْہِ (ترمذی) اللہ اپنے بندہ کی اس وقت تک امداد کرتا ہے ، جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد کرتا رہتا ہے ۔

حدیث کی مشہور کتابوں میں لکھا ہوا ہے کہ جب سرورِ دو عالم کی خدمت میں کوئی سائل حاجت مند آتا تھا تو آپ صحابہؓ کرام سے فرماتے تھے کہ تم اس کی سفارش کرو تاکہ تمہیں بھی ثواب حاصل ہو اس طرح قرآن حکیم کی آیات اور سرورِ دو عالم کے ارشادات سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ ہر سچے مسلمان کا دینی اور اخلاقی فرض ہے کہ وہ حاجتمندوں

کی مدد کرنے میں غفلت نہ کرے اور ہر جائز صورت سے اپنے امکان بھر اُن کی اعانت میں حصّہ لینے کی کوشش کرے - بلاشبہ اگر یہ جذبہ پوری طرح عمل میں آجائے تو اسلامی معاشرہ بڑے بڑے مصائب اور آفتوں سے نجات حاصل کر سکتا ہے اور جہاں تک اس میں اقتصادی، سماجی، علمی، فنّی اور اخلاقی استحکام پیدا ہوگا اس کے افراد میں باہمی اخوت ومحبّت، اتحاد واتفاق اور یگانگت کا جذبہ بھی ابھرے گا پھر نتیجہ میں وہ اپنی اندرونی اور بیرونی زندگی کے تمام شعبوں میں ایک مثالی مقام اور مثالی کردار حاصل کر سکے گا -

---

خود اعتمادی

انسان کی تمام کامیابیاں اور ترقیاں صرف اس بات پر منحصر ہیں کہ وہ اپنی ذات اور اپنی صلاحیتوں کو پوری طرح پہچانے اور یہ سمجھے کہ اللہ نے اُسے کتنی قدرت، طاقت اور صلاحیت بخشی ہے اور اسکو تمام کائنات سے اشرف و افضل بنایا ہے۔ اس کے برخلاف تمام کمزوریوں اور ناکامیوں کی بنیاد یہ ہے کہ انسان اپنی ذات اور اپنی صلاحیتوں کو نہ پہچانے۔ جبکہ یہ ایک صاف حقیقت ہے کہ بغیر اپنی صلاحیتوں کو پہچانے ہوئے ہم نہ تو زندگی کی قدروں اور بلندیوں کو حاصل کر سکتے ہیں جن کے لیئے ہمیں پیدا کیا گیا ہے اور نہ اپنے اس عظیم خالق کی معرفت حاصل کر سکتے ہیں جس نے ہمیں پیدا کیا ہے۔ اس بات کی طرف، سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے اس فرمان میں اشارہ کیا ہے: مَنْ عَرَفَ

نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ "، جس شخص نے اپنے آپ کو اور اپنی ذات کو پہچان لیا اس نے اپنے پروردگار کو پہچان لیا۔ اس حدیث کی روشنی میں ہم فوراً اس نتیجہ تک پہنچ جاتے ہیں کہ اپنے نفس، اپنی ذات اور اپنی عملی اور شعوری صلاحیتوں، وسعتوں اور قابلیتوں سے واقف اور باخبر ہو جانا ہی انسان کے لیئے صحیح معنی میں انسان بننے کا وسیلہ ہے یہی وہ دروازہ ہے جس سے وہ اپنی زندگی کو کامیابی کی بلند ترین منزل تک پہنچا سکتا ہے اور یہی وہ بنیادی وسیلہ ہے جس سے وہ اللہ کی معرفت حاصل کر کے اپنے فرائضِ زندگی سے آگاہی حاصل کر سکتا ہے اور ایک ایسی صاف اور سیدھی اور یقینی راہ تلاش کر سکتا ہے جس میں اسے تمام ناکامیوں کمزوریوں اور گمراہیوں سے نجات مل سکے۔ تمام نیکیوں کا مرکز انسان کی خود اپنی ہی ذات ہے اور ہر برائی کا مرکز بھی یہی ہے اس لیئے جب تک وہ اپنی ذات سے واقفیت حاصل نہ کرے گا اور اپنی صلاحیتوں کے بُرے اور اچھے پہلوؤں کو نہ سمجھ لیگا اُس وقت تک وہ کسی طرح بھی برائیوں اور ناکامیوں سے نہیں بچ سکتا اور نہ ترقی و کامیابی سے

ہمکنار ہو سکتا ہے ۔ اللہ نے قرآنِ حکیم کے سورۂ آلِ عمران ۱۳۹ میں فرمایا ہے : وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ "مسلمانو! تم کبھی ہمت نہ ہارنا اور کبھی غمگین نہ ہونا یاد رکھو! اگر تم سچے ایماندار ہو تو یقیناً تم ہی سب پر غالب رہو گے ۔

بلاشبہ ایمان نام ہے خداشناسی کا اور صرف اسی کی حکومت و عظمت پر یقین رکھنے کا اور یہ مقام اس وقت تک حاصل ہی نہیں ہو سکتا جب تک انسان اس حقیقت سے واقف نہ ہو جائے کہ وہ خود کیا ہے اور اس کا اپنے خالق سے تعلق کیا ہے اور اس کا رشتہ کائنات سے کیا ہے یعنی یہ نہ جان لے کہ وہ خود اس کائنات کیلئے بنا ہے یا یہ ساری کائنات خود اسی کی خدمت کے لیئے بنائی گئی ہے ۔ جب وہ اپنی حقیقت سے آگاہ ہو جائے گا تو پھر اس کے کانوں میں پردۂ شعور سے ابھر کر یہ آواز آنے لگے گی ؎

نہ تو زمیں کے لیئے ہے نہ آسماں کیلئے
جہاں ہے تیرے لیئے تو نہیں جہاں کیلئے

تمام کامیابیوں کا راز یہی ہے کہ انسان اپنی صلاحیتوں

کو سمجھے اور دوسروں کا سہارا لینے کے بجائے خود اپنے ہی پیروں کا سہارا لے اور خود اپنی ہی طاقت و قوت پر بھروسا کرے۔ اُسے نہیں معلوم کہ اس کی قوتیں لامحدود ہیں اور اس کی طاقتیں غیر فانی ہیں۔

سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی مکّی اور مدنی زندگی ہمارے لیئے خود اعتمادی کی ایک بلند ترین مثال ہے۔ مکّہ کی زندگی اور بدر کبریٰ کی جنگ سے لے کر تبوکؔ تک قدم قدم پر حضورِ انورؐ اور آپ کے بہادر اور وفادار ساتھیوں نے جس زبردست خود اعتمادی کی مثال پیش کی وہ اپنا آپ ہی جواب تھی۔ اگر ہم اس فرمانِ رسولؐ عربی صلی اللہ علیہ و آلہ وسلّم کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش کریں گے اور اپنے آپ کو پہچان لیں گے۔ اپنی ذاتی قوتوں کی معرفت حاصل کر لیں گے تو ہم اُسے یاد رکھیں کہ آسمانوں کے ستارے بھی ہمارے قدموں میں آگریں گے اور دنیا کی کوئی طاقت ہمیں کبھی تسخیر نہ کر سکے گی۔

نیک سلوک

حُسنِ سلوک اور نیک برتاؤ کی اسلام نے طرح طرح سے تعلیم دی ہے۔ سورۂ نساء میں اللہ نے فرمایا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے۔ اُللہ کی عبادت کرو اور اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ۔ ماں باپ کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو اور رشتہ داروں اور یتیموں سے محتاجوں سے اور قرابتدار پڑوسی سے، اجنبی پڑوسی سے، پاس رہنے والے سے، مسافر سے اور جو کوئی تمہارے قبضہ میں ہو اور تم اس کے مالک ہو اس سے بھی غرض ان سب سے نیک برتاؤ اور اچھا سلوک کرو۔ بے شک اللہ کسی غرور اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ (آیہ ۳۶)

یہاں اللہ نے اپنی عبادت کا حکم دینے کے بعد سب سے پہلے والدین سے اچھا برتاؤ کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس سے ماں باپ کے مرتبہ کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ ہم اُن ہی کی وجہ سے پیدا ہوئے، انھیں نے ہماری دکھ جھیل کر پرورش کی

اور ہماری وجہ سے کتنی راتیں جاگ کر اور کتنے دن مصیبت جھیل کر گذار دیئے پھر ہم پر اُن کا کیوں حق نہ اللہ کی عبادت کے بعد سب سے زیادہ نہ ہو۔ اسی لیئے اللہ نے اسکو اسقدر اہمیت دیکر بیان فرمایا ہے۔ ایک مرتبہ کا ذکر ہے حضور انور نے فرمایا: بڑا بدنصیب ہے! بڑا بدنصیب ہے! صحابۂ کرام نے عرض کی: حضور! کون بڑا بدنصیب ہے؟ فرمایا وہ آدمی جس کے ماں باپ موجود ہوں اور پھر بھی وہ ان کی خدمت کر کے جنت حاصل نہ کرے"۔ اللہ کی عبادت اور ماں باپ کی اطاعت کے حکم کے بعد اس آیت میں جس کا ترجمہ ابھی میں نے بیان کیا رشتہ داروں کے ساتھ حسن سلوک کا حکم ہے پھر یتیموں اور حاجتمندوں کی مدد کرنے اور ان کے ساتھ نیکی کا برتاؤ کرنے کا فرمان ہے۔ حضور نے ایک حدیث میں فرمایا ہے کہ جو شخص یتیموں اور بیواؤں اور محتاجوں کی خدمت میں لگا رہتا ہے اس کو وہی درجہ ملیگا۔ جو خدا کی راہ میں جہاد کرنے والوں کا ہوتا ہے" آیت میں اس کے بعد اس کا حکم ہے کہ اپنے پڑوسی جو رشتہ دار نہ ہوں یا رشتہ دار پڑوسی سب پر احسان کیا کرو اور اسکے ساتھ بھی اچھا سلوک کیا کرو۔ حضور نے فرمایا ہے کہ اللہ کی قسم وہ آدمی مؤمن نہیں ہے جس کا پڑوسی اسکی شرارتوں سے محفوظ نہ ہو"۔ پھر وہ پڑوسی چاہے ہمارا

رشتہ دار نہ ہو بلکہ ہم مذہب یعنی مسلمان بھی نہ ہو اور کافر و مشرک ہی کیوں نہ ہو جب بھی ہمارے اللہ اور رسول صلی اللہ کا حکم ہے کہ ہم اسکے ساتھ اچھا برتاؤ کریں اور اسکے لیئے تکلیف کا باعث نہ بنیں۔ پھر ساتھیوں کے ساتھ بھی نیک سلوک کرنے کا حکم ہے۔ خواہ وہ ساتھی اسکول اور کالج کے ہوں، خواہ دفتر کے ہوں، خواہ سفر کے ہوں مختصر یہ کہ ہر مسلمان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنے ساتھیوں کی عزت اور احترام کرے اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا کرے۔ "مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ" یعنی جو تمہارے قبضہ میں ہوں۔ اس جملہ کے اندر وہ تمام لوگ آ گئے جو کسی طرح سے بھی ہمارے زیر اقتدار ہوں جیسے کنیز، غلام، نوکر چاکر، قیدی، رعایا یہاں تک کہ وہ جانور بھی جو ہماری قید میں ہوں۔ ان سب ہی سے اچھا برتاؤ کرنا اسلام کے نزدیک ضروری ہے۔ پھر آخر میں فرمایا گیا ہے کہ اللہ اس آدمی کو دوست رکھتا ہے جو دوسروں سے جھک کر ملے، اللہ کی عبادت کرے اور تمام لوگوں سے نیک برتاؤ کرے۔ اگر آج اسلام کے اس حکم پر پوری شدت اور پورے خلوص کے ساتھ عمل کیا جائے تو ہماری یہ دنیا اور ہمارا یہ معاشرہ خوشحالی اور اور آرام و امن و سکون کی جنت بن جائے۔

رحم و مہربانی

ہم اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں جس چیز کے سب سے زیادہ محتاج ہیں وہ رحم اور مہربانی کا جذبہ ہے جس کا حاصل یہ ہے کہ ایک آدمی دوسرے آدمی کے ساتھ مہربانی کا برتاؤ کیا کرے اور محبت و خلوص اور رحمدلی سے پیش آیا کرے ۔جب تک یہ جذبہ موجود نہ ہو گا اس وقت تک کوئی معاشرہ کبھی ترقی نہیں کر سکتا اور نہ افراد ہی خوشحال رہ سکتے ہیں ۔ ہم سب اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ اللہ اپنے بندوں پر سب سے زیادہ مہربان اور رحم کرنے والا ہے اور وہ ہمیں بھی اس کا حکم دیتا ہے کہ ہم ایک دوسرے پر رحم کریں اور شفقت و محبّت سے پیش آتے رہیں ۔ اس کا ایک صاف اور واضح ثبوت یہ ہے کہ جب ہم سب مسلمان قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہیں تو پہلے "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" کہتے ہیں ۔ آپ دیکھئیے کہ اس میں لفظ اللہ جو اسمِ ذات الٰہی ہے اسکے

بعد جو اُس کے مقدّس صفاتی نام لیئے جاتے ہیں وہ "رحمان و رحیم" ہیں یعنی بے انتہا رحم فرمانے والا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کے نزدیک اس کے صفاتی ناموں میں وہ نام سب سے مقدّم ہیں جن سے اس کی رحمت ظاہر ہوتی ہے یہ صفتِ رحمت اسقدر اہمیت رکھتی ہے کہ اللہ نے اپنے رسولؐ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے رحیم وکریم ہونے کی شان کو قرآنِ مجید میں بڑی خصوصیت کے ساتھ اس طرح بیان فرمایا ہے: وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ (سورۃ انبیاء) یعنی (اے پیغمبرؐ) ہم نے تمہیں تمام جہانوں کے لیئے رحمت بناکر بھیجا ہے۔ (آیہ ۱۰۷)

سرورِ کائنات کی رحمدلی کا یہ عالم تھا کہ آپ بار ہا فرمایا کرتے تھے "جو شخص رحمدلی سے کام نہیں لیتا وہ ہم میں سے نہیں ہے" اور کبھی اس طرح فرماتے تھے کہ: "تم زمین پر بسنے والوں پر رحم کیا کرو تو آسمان والا یعنی اللہ تم پر رحم فرمائے گا۔" ایک مرتبہ ایک شخص اپنے چھوٹے سے بچہ کو اپنے سینہ سے لگائے ہوئے حضورؐ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا تو آپ نے فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے تم اس بچّہ سے

بڑی محبت رکھتے ہو۔ اس نے عرض کی جی ہاں! میں اس سے بہت محبت رکھتا ہوں اور اسے بے حد چاہتا ہوں۔ یہ سن کر آنحضرتؐ نے فرمایا کہ تم اس بات کو یاد رکھو کہ تمہارا خالق اور تمہارا اللہ اس سے بہت زیادہ تم سے محبّت رکھتا ہے اور تم پر بے حد رحیم ہے۔ ایک حدیث میں ارشاد ہوا ہے کہ: مسلمانوں کی باہمی محبت اور رحمدلی کی شان ایسی ہی ہونا چاہیئے جیسے ایک بدن ہوتا ہے کہ جب اس کے کسی عضو میں تکلیف پیدا ہوتی ہے تو پورا بدن دکھنے لگتا ہے بس یوں ہی تمام مسلمانوں کو چاہیئے کہ وہ ایک دوسرے کے درد اور تکلیف کو اپنے ذاتی درد کی طرح محسوس کیا کریں اور آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ شریک حال رہیں اور صرف یہی نہیں کہ آپ نے ہمیں رحم و شفقت کی تعلیم صرف مسلمانوں ہی کے لیئے دی ہو بلکہ کثیر حدیثوں میں حضورؐ نے حکم دیا ہے کہ ہم ہر انسان کے ساتھ رحم و شفقت کا برتاؤ کریں خواہ وہ کسی جگہ اور ملک کا رہنے والا ہو یا کسی مذہب کا پابند ہو بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہاں تک فرمایا ہے کہ ہم ہر جاندار پر رحم و شفقت سے کام لیا کریں۔

بلاشبہہ اسلام نے ہمیں ظلم سے روکا ہے اور محبت و رحم کی تعلیم دی ہے۔ اگر اسلام کی اس اہم ترین بنیادی تعلیم پر انسانی معاشرہ پوری طرح عمل کرنے لگے تو آج یہ خوف اور نفرت بھری ہوئی دنیا امن و سلامتی اور محبت کی جنّت بن جائے۔

اِحسان

"اِحسان" کے معنی نیکی کرنے کے ہیں، اسلام نے ہر ممکن صورت میں اس کا حکم دیا ہے کہ نیکی اور احسان کیا جائے۔ اگر ہر شخص اور انسانی معاشرے کا ہر فرد احسان کے اس مفہوم کو پوری طرح سمجھ لے اور ہر وقت اور ہر حالت میں نیکی کرنے کی سعی کرتا رہے تو پھر معاشرہ میں برائیاں اور خرابیاں کس طرح باقی رہ سکتی ہیں اور نتیجہ میں پورا معاشرہ امن و امان، اچھائی اور بھلائی، سُکھ اور خوشی، اطمینان و راحت کی جنّت بن سکتا ہے۔ آئیے سب سے پہلے ہم یہ دیکھیں کہ قرآن پاک میں "اِحسان" کے لفظ کو کِس کِس صورت سے اور کِس مفہوم میں بولا گیا ہے۔ اس سے ہمیں اندازہ ہو جائے گا کہ اسلام کے نزدیک احسان کے معنی کیا ہیں اور اس کے مفہوم میں کسقدر وسعت پائی جاتی ہے۔ چنانچہ (سورۂ کھف/ ۳۰) میں ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ

اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِیْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا"۔ بیشک جو لوگ ایمان لائے اور انھوں نے نیک عمل بھی کئے تو یقیناً ہم اس شخص کے اجر کو برباد نہیں کرتے جو نیک کام کرے۔ سورۂ قصص / " میں اس طرح فرمایا گیا ہے۔ وَاَحْسِنْ کَمَآ اَحْسَنَ اللّٰہُ اِلَیْکَ وَلَا تَبْغِ الْفَسَادَ فِی الْاَرْضِ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُفْسِدِیْنَ"۔ اور جس طرح اللہ نے تمہارے ساتھ حسن سلوک کیا ہے تم بھی اس کے بندوں کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ اور روئے زمین پر فساد نہ پھیلاؤ یقیناً اللہ فساد کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ یہاں یہ بات ہمارے ذہن میں رہنا چاہیئے کہ اس آیت میں احسان کو فساد کے مقابلہ میں اس کی ضد کی حیثیت سے بولا گیا ہے اور مقصود یہ ہے کہ احسان اور نیکی وہی چیز ہو سکتی ہے جس میں کسی رُخ اور کسی عنوان سے بھی بے اعتدالی اور فساد کی گنجائش موجود نہ ہو اس کے بعد دیکھئے، سورۂ نساء ۳۶/ میں ان لفظوں میں ہدایت فرمائی گئی ہے۔ وَاعْبُدُوا اللّٰہَ وَلَا تُشْرِکُوْا بِہٖ شَیْئًا وَّبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا وَّبِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَالْجَارِ ذِی الْقُرْبٰی وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِیْلِ وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ مَنْ کَانَ مُخْتَالًا فَخُوْرًا۔ یعنی اللہ کی

عبادت کرو اور کسی چیز کو اُس کا شریک نہ بناؤ اور ماں باپ کے ساتھ احسان یعنی نیکی اور حُسنِ سلوک کرتے رہو۔ اور رشتہ داروں کے ساتھ اور یتیموں، مسکینوں، رشتہ دار یا ہم مذہب یعنی مسلمان پڑوسی اور اجنبی یا وہ پڑوسی جو مسلمان بھی نہ ہو نیز وہ جو تمہارے ساتھ بیٹھنے والا ہو ہم درس ہم سفر، شریکِ تجارت اور ملازمت وغیرہ کے ساتھی سب ہی اس کے اندر آ گئے۔ اسی طرح مسافر خواہ وہ تمہارا مہمان ہو یا نہ ہو اور وہ کنیز اور غلام جو تمہاری ملک میں ہوں سب کے ساتھ نیکی اور حُسنِ سلوک کرو۔ بیشک اللہ اُن لوگوں کو دوست نہیں رکھتا جو خود بین اور اپنی بڑائی پر گھمنڈ رکھتے ہیں۔"
اس آیۂ کریمہ میں نیکی اور احسان سے مُراد حُسنِ سلوک اور اچھا برتاؤ ہے جس کی وسعت میں ماں باپ سے لے کر غلام اور کنیزیں تک شامل ہیں اور معاشرہ کا کوئی فرد بھی اس کے دائرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

احسان کی ایک دوسری قسم بھی ہے جس کی طرف سورۂ آلِ عمران/۱۳۴ میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔
"اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ فِی السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْکٰظِمِیْنَ الْغَیْظَ وَالْعَافِیْنَ عَنِ النَّاسِ ط وَاللّٰہُ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ"۔ صاحبانِ تقویٰ اور پرہیزگاروں کی صفتیں بیان کرتے ہوئے ارشاد

ہوتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو فراغت اور تنگی دونوں حالتوں میں اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہتے ہیں۔ غصہ کو ضبط کرتے ہیں اور لوگوں سے درگزر کرتے ہیں۔ اور اللہ احسان کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ اس آیت میں غصہ کو ضبط کرنے کا ذکر ہے جو خود بھی نیکی ہے اور ساتھ ہی "المحسنین" فرما کر اس بات کو بھی بتایا گیا کہ درگذر سے آگے بڑھ کر انعام واکرام اور مزید حسن سلوک بھی مفہوم "احسان" میں شامل ہے۔ اسی سے ملتا جلتا مفہوم سورۂ نحل ۹۰/ میں ملاحظہ کیجئے اللہ کا ارشاد ہے: اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَآئِ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ وَالْبَغْیِ یَعِظُکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ۔"

بیشک اللہ عدل کا، حسن سلوک کا، اہل قرابت کو عطیات دیتے رہنے کا حکم دیتا ہے اور کھلی ہوئی برائی اور مطلق برائی اور ظلم و سرکشی سے منع کرتا ہے۔ وہ تم کو نصیحت کرتا ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔

اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ "احسان" صرف عام نیکی ہی نہیں ہے بلکہ اس کا مقام عدل سے بھی آگے ہے۔ ان آیات کریمہ اور اسی طرح کی دوسری آیتوں سے یہ بات صاف طریقہ پر سمجھ میں آجاتی ہے کہ اسلام کے نزدیک

"احسان" کا لفظ انتہائی جامعیت اور وسعت رکھتا ہے اور اس کے وسیع مفہوم میں ایک معمولی نیکی سے لے کر انتہا درجہ کی نیکیاں بھی داخل ہیں غرض اچھائی اور نیکی کا ہر مظاہرہ خواہ وہ کسی نوعیت کا ہو "احسان" ہے اور اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ انسانی معاشرے کا ہر فرد اپنے ہر قول و فعل کو "احسان" کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کرے۔

اس کوشش کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ انسان کا خود ذاتی کردار بھی درست رہے گا اور اس کے اجتماعی کردار میں بھی کوئی بے اعتدالی نہ پیدا ہو سکے گی۔ ان آیات سے ہمیں اس کی بھی تعلیم دی گئی ہے کہ نیکی اور احسان کی صفتیں ہم اس لئے اختیار کریں کہ یہ اچھی صفات ہیں اور انھیں اختیار کرنا ہماری انفرادی اور اجتماعی فلاح کا سبب ہے نہ یہ کہ ہم اس میں تصنع اور دکھاوے سے کام لیں کیونکہ ایسا کرنے سے نہ تو ان صفات کا کوئی انفرادی یا اجتماعی فائدہ ہو سکتا ہے اور نہ حقیقی معنی میں انھیں احسان اور نیکی کہا جا سکتا ہے بلکہ اس تصنّع، دکھاوے اور جھوٹے مظاہرے سے فرد اور معاشرے میں بدترین خرابیاں بھی پیدا ہو سکتی ہیں۔

"احسان" کے اس وسیع تر مفہوم پر ہم اور آپ جس قدر بھی غور کریں گے، ہمیں اس کا اندازہ ہو جائے گا کہ ہماری

زندگی کا کوئی رُخ بھی اِس کے اِنطباق اور اس کی شمولیت سے خالی نہیں ہے ، والدین اور اولاد کے رشتے ، لوگوں کے خاندانی روابط ، چھوٹوں اور بڑوں کے تعلقات ، رعایا اور حکومت کے رابطے ، شوہر اور زوجہ کے رشتے ، اساتذہ اور شاگردوں کے رشتے ، تجارتی ، تعلیمی ، سیاسی ، مذہبی اور ثقافتی رابطے ، محکموں اور افسران کے تعلقات ، قرض لینے والوں اور قرض دینے والوں کے تعلّقات ، مزدوروں اور اُن سے کام لینے والوں کے تعلّقات ۔ غرض کون سا شعبۂ زندگی ایسا ممکن ہے جس میں اسلام کا دیا ہوا نیکی اور احسان کا تصور ممکن نہ ہو پھر اب اس سے بڑھ کر اس کے مفہوم میں وسعت اور کیا ہو سکتی ہے جب قرآن پاک نے اس کا اِعلان کر دیا ہے کہ :- وَاَحْسِنْ كَمَا اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ (قصص - ۸) یعنی جس طرح اللہ نے تمھارے ساتھ احسان کیا ہے تم بھی اس کی مخلوق کے ساتھ اسی طرح احسان کرو ۔ درحقیقت یہ ایک خاص انداز ہے "احسان" کی اہمیت ظاہر کرنے کا ورنہ ظاہر ہے کہ اللہ کی طرح کون احسان کر سکتا ہے ، مقصود دراصل یہ ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ نیکی کرنے اور احسان کرنے کی سعی کریں خواہ یہ نیکی اپنی ذات کے لئے ہو یا دوسروں کے لئے اور خواہ عام نیکی اور اچھائی ہو یا احسان کی وہ شکل ہو جسے ہم اپنی اردو

زبان میں "احسان" کہتے ہیں جس سے مُراد فضل و کرم ہوا کرتا ہے اس سلسلہ میں ایک بات کہنا ضروری ہے کہ اسلام نے نیکی کا جو حکم دیا ہے اس میں کسی قسم کی شرط اور قید نہیں ہے۔ یہ مطلق حکم ہے کہ ہر شخص کو اپنی طرف سے ہمیشہ نیکی کرنے ہی کی کوشش کرنا چاہیئے۔ اسی طرح یہ اُصول کہ جو شخص ہمارے ساتھ احسان کرے ہم بھی اس کے جواب میں اس کے ساتھ احسان کریں اور اگر ایسا نہیں ہے تو ہمیں احسان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسلام کے نزدیک ایسا نہیں ہے بلکہ نیکی اور احسان کا حکم مطلق ہے۔

حدیث میں ہے۔ ایک مرتبہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کسی نے عرض کیا کہ میں ایک شخص کے پاس سے گزرتا ہوں تو میری خاطر مدارات نہیں کرتا اور نہ مجھے مہمان نہیں بُلاتا تو کیا جب وہ میرے پاس آئے تو میں بھی اُس سے بداخلاقی کا بدلا لوں اور اس کی کوئی خاطر نہ کروں۔ آپ نے فرمایا نہیں! تم ایسا نہ کرنا بلکہ اُس کی خوب خاطر کرنا اور اُسے مہمان رکھنا"۔

اسلام نے اس طرح اس جذبہ کی مُطلق نفی کر دی کہ اگر کوئی ہمارے ساتھ بُرائی کرتا ہے تو ہم بھی اُس کے ساتھ بُرائی کریں گے اور اگر وہ احسان اور نیکی کرتا ہے تو ہم بھی

اُس کے ساتھ احسان کریں گے ورنہ نہیں۔ بلکہ اسلام نے "احسان اور نیکی"، کا ہر حال میں حکم دیا ہے چاہے دوسرا ہمارے ساتھ نیکی کرے یا نہ کرے یعنی ہمیں اپنے نیک کام کے لئے دوسرے کی نیکی کا انتظار نہیں کرنا چاہیئے۔ اور بلا انتظار نیکی کے کاموں اور احسان و کرم کی کوششوں میں سبقت حاصل کرنے کی بھرپور سعی کرنا چاہیئے۔

عبادت کا وسیع مفہوم

عبادت کے مفہوم کی وسعت سمجھنے کے لئے پہلے ہمیں خود عبادت ہی کے مفہوم کو سمجھ لینے کی ضرورت ہے کہ وہ کیا ہے کیونکہ بغیر عبادت کے معنی اور مفہوم کو سمجھے ہوئے اُس کی وُسعت یا اس کا محدود ہونا تو ہماری سمجھ ہی میں نہیں آسکتا اس بناء پر پہلے ہم اسے دیکھیں کہ خود "عبادت" کسے کہتے ہیں۔ عبادت درحقیقت اطاعت ہی کا دوسرا نام ہے لیکن فرق صرف اس قدر ہے کہ عبادت، اطاعت کی اُس

بلندی اور شدت کا نام ہے جس کے بعد اطاعت کا کوئی اور درجہ باقی نہ ہو۔ دوسرے لفظوں میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ اطاعت ایک وقت میں کئی شخصیتوں کی بھی ہو سکتی ہے مثلاً ماں کی اطاعت کے ساتھ، باپ، دادا، استاد حاکم اور اسی طرح کے دوسرے لوگوں کی اطاعت، مگر عبادت میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہوتا اور یہ ایسی اطاعت ہے جس میں کوئی دوسرا شرکت کر ہی نہیں سکتا یعنی اگر ہم عبادت کر سکتے ہیں تو صرف ایک ہی شخصیت کی اگر ہم کسی اور کو اس کے ساتھ شریک کریں گے تو پھر وہ عبادت نہیں رہے گی بلکہ زیادہ سے زیادہ اطاعت ہی کہی جا سکے گی۔ متعدد دیوتاؤں اور دیویوں کی پوجا کرنا اور چیز ہے اس کا قیاس عبادت کے اصلی و حقیقی مفہوم پر نہیں کیا جا سکتا۔

تو اب عبادت کے معنی یہ ہوں گے کہ ہم اپنے پورے جسم و روح اور اپنی تمام خواہشات، اپنے تمام ارادوں اور اپنی زندگی کے ہر رخ کو اپنے معبود کے حکم، اُس کی مشیت اور اُس کے ارادہ کا تابع بنا دیں۔ ہماری خواہشیں اُس کی مشیئت کے محور پر گھومتی رہیں۔ ہمارے ارادے اس کے اشاروں پر گردش کریں اور ہمارا ہر قول و فعل

اس کے احکام اور ہدایات کا آئینہ بن جائے۔ یہ تو ہیں عبادت کے وسیع تر معنی لیکن اسی کے ساتھ ہم بعض مخصوص قسم کی حرکت، سکون یا کسی خاص طرح کی عبادتوں اور دعاؤں کے پڑھنے کو بھی عبادت کہتے ہیں اور اس لفظ کو کچھ خصوصی اعمال کے لئے بھی بولتے ہیں مگر حقیقت میں یہ تمام اعمال دعائیں یا اعضاء و جوارح کی خصوصی حرکات، عبادت کے وسیع تر مفہوم کی قسمیں ہیں جن میں عبادت کا عام مفہوم کسی طرح بھی محدود اور منحصر نہیں ہو سکتا دوسرے لفظوں میں نماز بھی عبادت کی ایک قسم ہے روزہ اور حج و زکوٰۃ وغیرہ بھی عبادت کی قسمیں ہیں۔ لیکن عبادت کا عام اور وسیع تر مفہوم ان قسموں میں منحصر نہیں ہے بلکہ وہ تو انسان کی پوری زندگی اور اس کے تمام اعمال یہاں تک کہ اس کی فکر و ادراک اور شعور پر بھی محیط ہے۔ اس طرح انسان کا شعور اس کی فکر اور اس کے تمام اعمال اگر اس کے معبود کی مرضی کے مطابق ہوں تو یہ عبادت کا وسیع تر مفہوم ہوگا۔ اور اگر اس کی کچھ خاص شکلیں مقرر کر لی جائیں گی تو وہ عبادت کی قسمیں کہلائیں گی مگر عبادت کی شکلیں اور طریقے مقرر کرنا بھی خود انسان کا کام نہیں ہے بلکہ اس کا تعین بھی معبود ہی کے حکم

سے ہوگا عبادت کی بعض اقسام وہ ہیں جن کی شکل و ترتیب کے ساتھ اُن کے اوقات بھی معین و مقرر ہوتے ہیں ایک مخصوص زمانہ کی عبادت دوسرے وقت اور زمانہ میں نہیں کی جاسکتی جیسے حج کہ وہ ذی الحجہ ہی میں ہو سکتا ہے کسی اور زمانہ میں نہیں ہو سکتا اسی طرح نماز دن کی جو ترتیب معین ہے اور صوم کے جو احکام مقرر ہیں ان کو اپنی مرضی سے بدلا نہیں جاسکتا بعض عبادتیں وہ ہیں جن کا کوئی وقت مقرر نہیں ہے جیسے کائنات میں غور و فکر کرنا کہ یہ بھی عبادت ہے اور بہترین عبادت ہے پھر اس کا کوئی وقت بھی مقرر نہیں یا اسی طرح تسبیح و تہلیل کرنا، جائز علوم کی تحصیل، راہ خدا میں صرف کرنا، غریبوں اور بے سہارا لوگوں کی مدد کرنا اور اسی قسم کے دوسرے نیک کام سب ہی عبادت ہیں مگر ان کا کوئی وقت مقرر نہیں۔

اسلام نے تو جاگنے کی حالت کے ساتھ بعض صورتوں میں سونا بھی عبادت قرار دے دیا ہے جیسے روزہ کی حالت میں اگر کوئی سو جائے تو اس کا سونا اور سانس لینا بھی عبادت ہو جاتا ہے۔

عام تصور یہ ہے کہ عبادت صرف نماز، روزہ اور حج وغیرہ ہی کا نام ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ مسلمان کی پوری

زندگی۔ اُس کے تمام اعمال و افعال اور اُس کے تصورات و خیالات و افکار تک عبادت میں شامل ہو جاتے ہیں اگر وہ اللہ کی مرضی اور ہدایات کے مطابق ہوں۔

اس کے ساتھ ہی ایک بات ہمیں کسی وقت بھی فراموش نہ کرنا چاہیئے وہ یہ کہ عبادت کے لئے ہر صورت میں نیّت اور ارادہ ضروری ہے یعنی بغیر نیّت کے کوئی عمل بھی عبادت نہیں بن سکتا اس بنا پر اگر صبح سے شام تک کوئی شخص فاقہ کرے نہ پانی پیئے اور نہ غذا کھائے مگر روزہ کی نیت نہ ہو تو یہ فاقہ کبھی روزہ نہیں بن سکتا۔ اسی طرح گھنٹوں کوئی شخص بالکل نمازی کی طرح ہاتھ پیر وں کو حرکت دیتا رہے مگر نیّت نماز کی نہ ہو بلکہ ورزش کی نیّت سے یہ کام کرے تو کبھی ہرگز اس عمل کو نماز نہیں کہا جائے گا۔

غرض مسلمان کی پوری زندگی اور اُس کے ادراک و شعور اور تمام افعال و اعمال اللہ کی اطاعت و عبادت کے ارادہ سے اگر ہوں تو وہ عبادت ہوں گے۔

قرآن پاک میں عبادت کے مفہوم کی اسی ہمہ گیری کی طرف ان لفظوں میں اشارہ فرمایا گیا ہے۔ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَاشَرِیْکَ لَہٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝ الانعام (۱۶۲)

اے رسولؐ کہدو! بیشک میری نماز اور میری ساری عبادتیں اور میری زندگی اور میری موت اللہ ہی کے لئے ہے جو سب جہانوں کا پروردگار ہے"

یہ ہے وہ اصلی تصوّر عبادت کا جسکی اسلام نے تعلیم دی ہے اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ ایک سچّا مؤمن جو کام بھی اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لئے اُس کے احکام کے مطابق بجالاتا ہے وہ عبادت ہے۔ جو عبادتیں مقرّرہ معیّن شکل و ترتیب کے ساتھ ہمیں بتائی گئی ہیں وہ تو ہیں ہی عبادت لیکن اِسی کے ساتھ ہماری زندگی کا ہر کام بھی عبادت ہے بشرطیکہ وہ اللہ کی رضامندی کے لئے ہو، اس طرح ہمارا حُصولِ علم و ہُنر کی کوشش کرنا، تجارتی کاروبار کرنا، زراعت کرنا صرف انسان ہی کی نہیں بلکہ جانوروں تک کی نگہداشت اور خدمت کرنا، مزدوری اور محنت کے کام کرنا، فسادات اور تخریبی کاموں میں اِصلاحی کوششیں کرنا، لوگوں کو نیکی کی طرف دعوت دینا خود علم حاصل کرنے کے بعد دوسروں کو علم سکھانا اور اسی طرح کے تمام سماجی، علمی، تجارتی، زراعتی اور عام رفاہی اور فلاح و بہبود اور بھلائی کے لئے سعی و کوشش کرنا۔ اگر اللہ کی خوشنودی کے لئے اور اُس کے حکم کے مطابق ہے تو یقیناً عبادت ہے۔

اسی کے ساتھ ہم یہ بات بھی یاد رکھیں کہ عبادت کے درجے اور مرتبے بھی ہوا کرتے ہیں اسی کے لئے حدیث میں کہا گیا ہے کہ "اَفْضَلُ الْاَعْمَالِ اَحْمَزُهَا" زیادہ فضیلت اس نیک کام میں ہے جس کے کرنے میں زیادہ مشقّت برداشت کرنا پڑے پھر ایک بات یہ بھی ضرور سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ نے اگرچہ بلاتخصیص زندگی سے اور موت سے متعلق ہر اُس کام کو عبادت قرار دے دیا ہے جو اُس کی رضا کے لئے ہو لیکن ہر کام اور ہر عبادت کی حیثیت بھی مقرر کر دی ہے اور اس کی حدوں کا تعین بھی کر دیا ہے جس کے مطابق ہمیں انکو انجام دینا ہے۔ اور اگر ہم اپنی ذاتی مرضی سے اس کے بنائے ہوئے نظام عبادت میں تبدیلی کریں گے تو ہمارا یہ عمل بجائے عبادت کے نافرمانی، عصیاں بلکہ کفر و بدعت میں تبدیل ہو جائے گا مثلاً ہم صبح کی دو رکعت نماز فرض کے بجائے چار رکعت فرض بنا ڈالیں اور نماز مغرب کی تین رکعت فرض کے بجائے ایک یا دو رکعت فرض بنالیں یا پھر رمضان کے روزے رکھکر یہ سمجھ لیں کہ اتنی بڑی نیکی تو ہم نے کر ہی لی ہے اب نماز پڑھنے اور حج وزکوٰۃ کی کیا ضرورت ہے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ جسقدر نیکیاں اور عبادتیں اللہ کی طرف سے معیّن کر دی گئی ہیں انھیں بعینہ اُس کی معیّن کی ہوئی ترتیب، تعداد، وقت اور شکل میں

ہمیں ادا کرنا ہے اور ان سب ہی کو ادا کرنا ہے۔ ہمیں قطعاً اس کا اختیار نہیں ہے کہ ہم ان میں سے بعض کو اختیار کریں اور بعض کو چھوڑ دیں یا اپنی مرضی سے بغیر اجازتِ خداوندی اس میں اضافہ یا کمی کر دیں۔

غرض مردِ مومن کی پوری زندگی عبادت ہی عبادت ہے۔ بس شرط یہی ہے کہ وہ رضائے الٰہی اور حکمِ خداوندی کے مطابق ہو۔

تجارت کے اسلامی اصول

تجارت کو کسی قوم کی معاشی فلاح و بہبود میں جو بنیادی حیثیت حاصل ہے وہ ہر سمجھدار انسان جانتا ہے۔ اسلام نے اس سلسلہ میں خاص طور پر ہدایات کی ہیں اور مسلمانوں کی ترقی و استحکام، آزادی و خودمختاری اور خوشحالی کے لیئے تجارتی کاروبار پر شدت کے ساتھ زور دیا ہے۔ ایک حدیث کا ترجمہ یہ ہے۔ "تجارتی کاروبار کو ترک نہ کرو ورنہ تم ذلیل و خوار ہو جاؤ گے۔ تجارت کرو اللہ تمہیں برکت عطا فرمائے گا۔" دوسری حدیث کا ترجمہ یہ ہے۔ "جو شخص تجارت کو چھوڑ دیتا ہے اُسکی دو تہائی عقل چلی جاتی ہے۔ تجارت ترک نہ کرو کہ اس سے عقل کا زوال ہوتا ہے۔ اپنے اہل و عیال کی معیشت کے لیئے تم خود کوشش کرو اور ایسا نہ ہونے دو کہ تم خود تو ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہو اور وہ لوگ تمہارے لیئے محنت اور سعی کریں۔ بعض حدیثوں میں تجارتی کاروبار کو راہِ خدا میں جہاد

کے برابر بتایا گیا ہے۔ اور بعض میں اسے نماز کے بعد فضیلت کا درجہ دیا گیا ہے۔ غرض تجارت ایک ایسی چیز ہے جسے اسلام نے مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیئے اہم ترین حیثیت دی ہے۔ جس وقت سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے مکہ میں اسلام کی دعوت کا آغاز کیا تھا اس وقت قریش کی زندگی کا بھی ایک بڑا سہارا تجارتی کاروبار ہی تھا اور وہ کثیر تعداد میں گرمی اور جاڑے کی فصلوں میں شام اور یمن کے سفر کیا کرتے تھے۔ آغازِ دعوت اسلام اور ہجرت کے ابتدائی ایام میں مسلمان طرح طرح کی آزمائشوں میں گھرے ہوئے تھے اس لیئے انھیں اس کا موقع نہیں مل سکا تھا کہ وہ تجارتی میدان میں آگے قدم بڑھا سکیں۔ پورا ماحول ان کا دشمن تھا اور زندگی کے تمام راستے اُن کے لیئے بند ہو چکے تھے لیکن کچھ عرصہ کے بعد جب سرورِ کائنات کی عظیم ترین قیادت کی بدولت انھیں قوت حاصل ہونے لگی اور اُن کے استحکام اور فلاح و بہبود کی صورتیں ابھرنے لگیں تو ان کو رسول عربی صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم نے تجارتی کاروبار کی تنظیم کا اور اسے آگے بڑھانے کا شدت کے ساتھ حکم دیا اور اس حقیقت سے آگاہ فرمایا کہ

بغیر تجارتی کاروبار میں کامیابی حاصل کئے انھیں ایک خود مختار اور باوقار زندگی نہیں مل سکتی اور یہ کہ جو قومیں تجارت کی دنیا میں کوئی باعزت مقام نہیں رکھتیں وہ ہمیشہ ذلیل اور دوسروں کی غلام رہا کرتی ہیں لیکن ساتھ ہی اسلام نے تجارتی کاروبار کے لیئے ایسے اصول اور قوانین مقرر کر دیئے ہیں جنکے مطابق کام کرنے سے کبھی وہ انفرادی اور اجتماعی خرابیاں نہیں پیدا ہو سکتیں جو ان قوانین سے لاپروا اور آزاد رہ کر پیدا ہو سکتی ہیں۔

ان بنیادی قوانین و اصول کے سلسلہ میں چند آیات و احادیث کو سامنے رکھنا بالکل کافی ہوگا۔ سورۂ نساء میں اللہ کا ارشاد ہے: "یَآاَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَکُوْنَ تِجَارَۃً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْکُمْ"۔ اے ایمان والو آپس میں ایک دوسرے کا مال ناحق طریقہ پر نہ کھاؤ ہاں البتہ اگر باہمی رضامندی سے کوئی تجارتی معاملہ ہو تو کوئی برائی نہیں ہے۔ (آیہ ۲۹)

دوسری ایک اور آیت سورۂ بقرہ ۲۷۵ کی ہے جس کے ایک حصہ میں فرمایا گیا ہے: "وَاَحَلَّ اللّٰہُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا"

اللہ نے بیع کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کر دیا ہے۔

ان آیتوں سے تجارت کا یہ اسلامی نظریہ واضح ہو گیا کہ اس میں کوئی فریق دوسرے فریق کو کسی قسم کا بھی دھوکا نہ دے اور اس سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرے اور جو کاروبار بھی ہو پوری دیانتداری اور باہمی رضامندی سے ہو اس طرح فریب دہی، ملاوٹ، عیب پوشی اور اسی طرح کی دوسری باتوں سے تجارتی کاروبار ہمیشہ کیلئے محفوظ رہ سکتا ہے، ایک شخص دوسرے پر جو بھروسا رکھتا ہے اس میں کوئی فرق نہ ہوگا، تجارت کی ساکھ قائم رہے گی اور بے اعتباری یا شک و شبہ سے جو نقصان تجارتی معاملات کو پہنچ سکتا ہے وہ نہیں پہنچے گا۔ کیونکہ تجارتی پیشہ میں دیانتداری کی ساکھ قائم ہو جانا اس کی کامیابی کے لیئے بہت بڑی ضمانت ہے۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اپنی ایک حدیث میں فرمایا تھا جس کا ترجمہ یہ ہے: اپنی زبان گفتگو میں سچی رکھو اور مال میں جو عیب ہو اسے کبھی نہ چھپاؤ۔ جو شخص تم پر بھروسا رکھتا ہے اسے نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرو یعنی ہر ایک کے ساتھ پوری سچائی کے ساتھ معاملت کرو اور دوسرے لوگوں کے

لیے بھی وہی اچھی اور جائز بات پسند کرو جو تم خود اپنے لیے پسند کرتے ہو۔ حق دو اور حق لو۔ نہ ڈنڈی مارو نہ خیانت کرو، بیشک سچا اور دیانتدار تاجر قیامت میں فرشتوں کے ساتھ ہوگا۔ قسمیں کھانے سے پرہیز کیا کرو کیونکہ جھوٹی قسمیں قسم کھانے والے کو جہنم کا مستحق بنا دیتی ہیں۔ یقیناً وہی تاجر قابلِ تعریف ہے جو حق دے اور حق لے۔

قرآنِ حکیم نے کثیر مقامات پر ناپ تول میں کمی کرنے والوں کی شدید مذمت کی ہے اور اس پر تباہی اور عذاب کا اعلان کیا ہے اور یوں بھی یہ کام حرام معاملت کے اصول میں شامل ہے جسکو اللہ نے منع کیا ہے اور اس باہمی رضامندی کے اسلامی اصول کے بھی منافی ہے جو بیچنے والے اور گاہک کے درمیان ضروری ہے۔ غرض اسلام نے جہاں تجارت کو مسلمانوں کی زندگی اور انفرادی و اجتماعی فلاح و بہبود، وقار و عزت اور ترقی و استحکام کا اہم ترین وسیلہ قرار دیا ہے ساتھ ہی قرآن و حدیث کے ذریعہ سے اس کے کچھ حدود سے بھی آگاہ کر دیا ہے۔ ان میں سب سے زیادہ نمایاں وہ حدیں اور وہ پابندیاں ہیں جو ضرر رسانی اور استحصال سے روکنے کیلئے ہیں جیسے

دھوکا، غلط بیانی، گراں فروشی، اپنے مال کی حد سے بڑھ کر تعریف کرنا جس میں مبالغہ آمیز اشتہار بازی قطعی طور پر داخل ہے۔ ناقص مال کو اچھا بتا کر پیش کرنا۔ قیمت کی تعیین کے متعلق جھوٹ سے کام لینا۔ خریدار کو طرح طرح سے اس کی ترغیب دینا اور ایسی ترکیبیں کرنا کہ وہ مال کی زیادہ قیمت دینے پر آمادہ ہو جائے۔ مال کو مہنگا فروخت کرنے کے لیئے ذخیرہ اندوزی کرنا جسے شرعی اصطلاح میں "احتکار" کہتے ہیں یا کسی اور طریقہ سے اشیاء کی قیمتوں میں مصنوعی گرانی پیدا کرنے کی کوشش کرنا۔ اسلام نے اسکی تعلیم دی ہے کہ فروخت کرنے والے کیلیئے یہ بات ضروری ہے کہ اگر اس کے مال میں کوئی عیب ہے تو اس سے خریدار کو پوری طرح مطلع کرے اسی طرح خریدار کی اضطراری حالت سے فائدہ اٹھا کر اس سے زیادہ دام وصول کر لینا بھی ان تمام ممنوع طریقوں میں شامل ہے جنکی تصریح کتاب وسنت میں کر دی گئی ہے اور اس قسم کا تجارتی معاملہ قطعی طور پر ناجائز اور فاسد ہو گا۔

اضطراری حالت سے مراد یہ ہے کہ ضرورت سے مجبور ہو کر کوئی اپنا مال بیچ رہا ہو یا کوئی ضرورتمند شخص کسی کا مال خرید رہا ہو

اس طرح "مُضطر" جسے ہم دوسرے لفظوں میں شدید ضرورتمند کہتے ہیں۔ بیچنے والا اور خریدنے والا دونوں ہی ہو سکتے ہیں عام طور پر لوگ ایسے موقعوں سے ناجائز فائدہ اٹھا لیتے ہیں شریعت اسلام نے لوگوں کو اس انسانی جرم سے شدت کے ساتھ منع کیا ہے۔ ایک حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ ایسے لوگ بدترین انسان ہیں جو کسی کی پریشان حالی سے اس قسم کا فائدہ حاصل کریں۔ خلاصہ یہ ہوا کہ اسلام نے اسی قسم کے تجارتی کاروبار کی اجازت دی ہے جس میں پوری دیانتداری سے کام لیا جائے۔ جس میں آپس کی بھرپور رضامندی حاصل ہو۔ دھوکا اور فریب کسی شکل اور کسی طریقہ پر بھی نہ ہو، بدنیتی، استحصال اور ضرر پہنچانے کا کوئی رخ موجود نہ ہو، کسی شخص کی پریشانی اور اضطراری حالت اور گھبراہٹ یا مصیبت سے فائدہ حاصل کرنے کی کوشش نہ ہو۔ وعدہ خلافی، غلط گوئی اور بد معالگی سے قطعی طور پر کام نہ لیا جائے۔ لکھا پڑھی اور تمام اندراجات صحیح طور پر کیے جائیں۔ اپنے مال کی مبالغہ آمیز تعریف کر کے یا کسی دوسرے طریقہ سے خریدار کو پھانسنے کی کوشش نہ کی جائے، مالِ تجارت کی صحیح اور واقعی کیفیت سے خریدار کو آگاہ کیا جائے اور ساتھ ہی اس

چیزوں اوران طریقوں سے تجارت کی جائے جن سے تجارت کرنا اسلام نے جائز قرار دیا ہے اور انھیں ممنوع وحرام نہیں کیا ہے۔ پھر تجارت کا مقصد انفرادی خوشحالی کے ساتھ اجتماعی فلاح اور خوشحالی بھی ہو یعنی غرضِ تجارت یہ نہ ہو کہ چند افراد دولت وثروت کے تمام وسائل اور نتائج پر قابض ہوکر بیٹھ جائیں اور دوسرے لوگ اُن کے بھکاری بن جائیں بلکہ محنت کشوں کو ان کا پورا پورا حق ملے اور سرمایہ پورے معاشرہ میں گردش کرتا رہے تاکہ سرمایہ لگانے والے اور محنت کرنے والے سب کے سب ملکر پوری قوم کو خوشحال بنا سکیں۔

جس تجارت میں حق طلبی اور حق شناسی کا وجود نہ ہو اور جس کی بنیاد ظلم، ضرر، نفس پروری، عیش پرستی، خودغرضی مفاد پرستی اور موقع پرستی اور دوسروں کے استحصال پر ہو وہ تجارت قطعاً غیر اسلامی ہے اور بلاشبہ وہ بنی نوع انسان کے لیئے تباہی اور بربادی کا ایک خوفناک پیغام ثابت ہوگی۔

چور بازاری

ایک مشہور حدیث میں حضرت سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم ارشاد فرماتے ہیں: لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِلنَّاسِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ وَحَتّٰی یُحِبَّ الْمَرْءَ لَا یُحِبُّہٗ اِلَّا لِلّٰہِ۔ (مسند احمد)

تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک پورا مؤمن نہ ہوگا جب تک وہ اور لوگوں کے لیئے بھی وہ چیز پسند نہ کرے جو اپنے لیئے پسند کرتا ہے اور جب تک وہ دوسرے شخص کو محض خدا کے لیئے دوست نہ رکھے۔

اس حدیث میں محبّت انسانی کی وسعت ساری انسانی برادری کے لیئے عام کردی گئی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اگر چور بازاری کا عمل ہمارے ساتھ کیا جاتا ہے تو ہم اس کو کبھی بھی پسند نہیں کرتے تو پھر ہمیں بھی اپنے دوسرے انسانی بھائیوں کے ساتھ اسی انسانی ہمدردی کے جذبہ سے کام لینا چاہیئے کہ دوسروں

کے توقعات بھی ہم سے وہی ہوں گے۔ جو ہمارے اُن سے ہو سکتے ہیں۔ اسلام نے اخلاق انسانی اور باہمی معاملات میں اعتدال پسندی اختیار کرنے کا جو طریقہ بتایا ہے اُس پر عمل کرنے سے چور بازاری کی لعنت معاشرہ سے بڑی آسانی کے ساتھ دور کی جا سکتی ہے۔ کیونکہ چور بازاری کرنے پر آدمی صرف اسی صورت میں آمادہ ہوتا ہے جب اس کے سامنے صرف اپنا ہی فائدہ ہوتا ہے اور دوسروں کے نقصان کی ذرّہ برابر اسے پروا نہیں ہوتی لیکن اگر وہ اس اصول پر عمل کرے کہ جو بات وہ اپنے لیئے ناپسند کرتا ہے وہ دوسرے کے لیئے بھی پسند نہ کرے تو کبھی دوسرے انسانی بھائی کی اذیت رسانی اور تکلیف دہی کا جذبہ اُس کے دل میں پیدا نہیں ہو سکتا اور کبھی کسی چیز کو وہ اپنے جائز حق سے زیادہ حاصل کرنے کی اور دھوکا دے کر دوسرے کا مال و دولت لینے کی کوشش نہیں کر سکتا۔

اسلام کے نزدیک جس طرح اپنے حقوق کا تحفظ انسانی فطرت کا جائز مطالبہ ہے بالکل اسی طرح دوسروں کے حقوق کی حفاظت کرنا بھی ضروری ہے اور ان کی مقرّرہ حدود میں غیر قانونی طور پر مداخلت کرنا کسی کے لیئے بھی جائز نہیں ہے

ہر انسانی فرد کا یہ فطری حق ہے کہ اُسے بازار کی عام معتدل قیمتوں پر اشیاء حاصل ہوں اور اُس کے ساتھ کوئی فریب اور دھوکا نہ کیا جائے۔ نہ قیمت کی ادائیگی میں خود اُس کی طرف سے کسی قسم کی فریب دہی کی جائے اور نہ قیمتوں کی شرح میں دوسروں کی طرف سے ایک دوسری مشہور حدیث نبویؐ میں یہ الفاظ ہیں :۔ وَكُونُوا عِبَادَ اللهِ إِخْوَانًا۔" اے اللہ کے بندو! آپس میں ایک دوسرے کے بھائی بن جاؤ۔ ایک اور حدیث میں ارشاد ہوا ہے :۔ مَنْ لَا يَرْحَمُ لَا يُرْحَمُ۔" جو شخص دوسرے پر رحم نہیں کرتا خود اس پر بھی رحم نہیں کیا جائے گا۔

مستدرک حاکم میں ہے : حضرت سرورِ دوعالم نے فرمایا : تم زمین کے رہنے والوں پر رحم کرو تو آسمان والا اللہ تم پر رحم فرمائے گا۔

ایک اور موقع پر حضور اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم فرماتے ہیں ۔ تمہاری مثال ایک پورے بدن کی سی ہے۔

دیکھو اگر تمہارے ایک عُضو میں بھی تکلیف ہوتی ہے تو تمہارا سارا جسم تکلیف میں مبتلا ہو جاتا ہے اور ہر عُضو

دکھ محسوس کرنے لگتا ہے، حالانکہ اصل میں درد سارے بدن میں نہ تھا۔ اسی طرح اُمّتِ مُسلمہ بھی ایک جسم ہے اور اُس کے تمام افراد اسی طرح سے اعضاء ہیں۔

ہر فرد کو چاہیئے کہ وہ دوسرے کی تکلیف اور اس کے دُکھ کا احساس کرے اور اس کو کسی طرح سے بھی تکلیف پہنچانے یا نقصان دینے کی کوشش نہ کرے ورنہ وہ قہرِ خداوندی کا مستحق ہوگا۔ اور اس معمولی سے نفع کے بدلے اُس کو دنیا و آخرت کا بڑا نقصان اٹھانا پڑے گا۔ اسی طرح ان الفاظ کے ساتھ بھی حضور صلّی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم نے انسان کے ضمیر کو بیدار فرمایا ہے اور اسے انسانی معاشرہ کے دوسرے افراد کے حقوق کی اہمیت کی تعلیم دی ہے۔ اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ النَّاسُ مِنْ لِسَانِہٖ وَیَدِہٖ "سچا مسلمان تو وہی ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے لوگ محفوظ رہیں۔

ہاتھ اور زبان کے افعال و اعمال کی وسعت کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سچّے مسلمان کی صحیح شان یہ ہے کہ وہ اپنے کسی عمل سے اور کسی گفتگو سے خواہ وہ گفتگو غلط بیانی، فریب دہی یا سخت کلامی یا کسی اور صورت سے ہو،

اپنے انسانی بھائی کو تکلیف نہ دے۔ یہ ہے وہ اخلاقِ اسلامی کا بنیادی پتھر جس پر اس کی پوری عمارت قائم ہوتی ہے۔ چور بازاری کی بنیاد دوسروں کی ایذا رسانی پر ہے، اُن کی دولت کے غصب کرنے کے جذبہ پر ہے، اُن کو دھوکا دے کر اُن کے حقوق میں ناجائز مداخلت پر ہے۔ یہ عمل یقیناً اس بنیادی تعلیم کے خلاف ہے جس سے اسلامی اخلاق کے ڈھانچے کی تشکیل ہوتی ہے۔ چور بازاری دوسروں کے حقوق زندگی پر ظالمانہ حملہ ہے اور اُن کے بنیادی استحقاق کے ساتھ کھلی ہوئی ناانصافی ہے اور یہ اس روحِ عدل کے خلاف ہے جس کی اسلام نے تعلیم دی ہے۔ قرآنِ حکیم کا اعلان ہے اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ (نحل - ۱۴) بے شک خدا انصاف اور نیکی کرنے کا حکم دیتا ہے۔ دوسری جگہ یہ ہے: وَاَوْفُوا الْکَیْلَ وَالْمِیْزَانَ بِالْقِسْطِ (انعام ۱۵۲) اپنی ناپ تول یعنی تجارت انصاف کے ساتھ کیا کرو۔" زندگی کے کاروبار کے لیئے تجارتی معاملات کی ہر شخص کو ضرورت پڑتی ہی رہتی ہے اس لیئے خصوصیت کے ساتھ ان میں عدل و انصاف کی تاکید فرمائی گئی ہے۔

کیونکہ ان معاملات میں بے اعتدالی سے صرف چند افراد ہی نہیں بلکہ پورا معاشرہ متاثر ہوتا ہے اور پھر آخر میں وہ ملک و ملت اور پورے انسانی ماحول کے لیئے معاشی اور اقتصادی بدحالی اور تباہی کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جس سے کوئی بھی محفوظ نہیں رہتا - قرآن کریم کا فرمان ہے: فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا (نساء ۱۳۵) تم عدل و انصاف کے بارے میں خواہش نفس کی پیروی نہ کرنا ایسا نہ ہو تم حق کے راستہ سے الگ ہو جاؤ - اس طرح چور بازاری کرنے والے کے سامنے دو چیزیں آتی ہیں - ایک اُس کی خواہش نفس ہوتی ہے کہ جتنے ہتھکنڈے ممکن ہوں دوسروں کی جیب سے وہ زیادہ سے زیادہ پیسے حاصل کرلے چاہے اُس کے انسانی بھائی کو اُس کے اِس عمل سے کتنا ہی نقصان پہنچ جائے اور دوسری چیز جو اس کے سامنے ہے وہ عدل و انصاف کرنے اور اپنے انسانی بھائیوں کے ساتھ ظلم نہ کرنے کا حکم الہٰی ہے اس لیئے اگر وہ اس حکم خداوندی پر عمل نہیں کرتا اور اپنی حرص و طمع کو، اپنی لالچ اور نفسانی خواہش کو اپنے اللہ کے حکم پر مقدم کردیتا ہے تو پھر وہ کس طرح ایک سچا مسلمان کہا جا سکتا ہے - اس چور بازاری کی وجہ سے اس کا پورا امکان موجود ہے کہ دوسرے

ناقص کردار کے لوگوں کو ظلم، رشوت ستانی، چوری، غاصبانہ طور پر دولت کی تحصیل کی طرف رغبت پیدا ہو جائے اور ان کے لیئے یہ چور بازاری ان گناہوں کے ارتکاب کی ہمت افزائی کا سبب بن جائے۔ اس لیئے کہ افراد کی عام طور پر قوتِ خرید کمزور ہوتی ہے اور یقیناً یہ چور بازاری ان کو ترغیب دے سکتی ہے کہ اشیاء کو کسی نہ کسی طرح حاصل کرنے کے لیئے ناجائز طریقوں سے دولت حاصل کریں اس طرح ایک شخص کی چور بازاری اس کا تنہا گناہ نہیں رہتی۔ بلکہ وہ اپنے اور پرائے گناہوں کے ایک طوفانی سلسلہ کی کڑی بن جاتی ہے جو پورے انسانی معاشرہ کو مسموم اور زہر آلود کر دیتی ہے۔ چور بازاری کی بیماری حرص اور لالچ کے جراثیم سے پیدا ہوتی ہے جس کا گہرا تعلق غلط نفسانی خواہشات سے ہے اور اگر جذبہ حرص و طمع کو دل سے بالکل نکال ڈالا جائے اور اس پر عدل و انصاف اور اخوت انسانی کے بنیادی معیار کے مطابق جس کی اسلام نے تعلیم دی ہے، قابو حاصل کر لیا جائے تو اس قسم کی کوئی بیماری انسان کے دل و دماغ میں نہیں پیدا ہو سکتی۔ قرآن کریم میں اللہ کا ارشاد ہے:-

وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ (تغابن ع۲)
جو شخص اپنے دل کی حرص، لالچ اور طمع سے بچا لیا گیا وہی کامیاب ہے۔

پھر دنیا کے ہر قانون کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ ہر شخص کی چیز اسی کی ملکیت ہے اور کسی دوسرے کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اس کی ملکیت سے ناجائز طریقہ پہ فائدہ حاصل کرے۔
انسان کی فطرت بھی اسی نظام امن کو طلب کرتی ہے اور اسلام نے بھی اسی نظام عدل کی تعلیم دی ہے۔ اب اگر کوئی شخص چور بازاری، دھوکے یا کسی اور ناجائز طریقہ سے کسی کی ملکیت پر قبضہ جمانا چاہتا ہے تو وہ یقیناً فطرتِ انسانی اور اسلام کے نظامِ امن و عدل کو درہم برہم کرنا چاہتا ہے۔
اسلام نے تو اس نظام عدل کو زندگی کا اہم ترین بنیادی اصول قرار دیا ہے۔
"یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوْٓا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ"
(النساء ۲۹)

اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال کو ناحق طریقہ پر نہ کھاؤ۔ اس آیۂ کریمہ نے ان تمام راستوں کو بند

کر دیا ہے جو ایمانداری کے خلاف ہیں یعنی کسی دوسرے کی چیز کوئی شخص دھوکا دے کر حاصل کرے یا چوری کرے، غصب کرے۔ خیانت کرے، رشوت لے، سود کھائے یا چور بازاری کے ذریعہ اس پر قبضہ حاصل کرے تو وہ اس آیت کے عموم میں داخل ہو جائے گا۔ چور بازاری کی بنیاد دھوکے اور فریب پر ہے اور انسانیت کے رہبر اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے: کہ جس نے ہم کو دھوکا دیا وہ ہم مسلمانوں میں سے نہیں ہے"۔

قرآن میں دوسرے مقام پر ہے:

اَوْفُوا الْكَيْلَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُخْسِرِيْنَ ج وَزِنُوْا بِالْقِسْطَاسِ الْمُسْتَقِيْمِ ۝ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ اَشْيَآءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۝ وَاتَّقُوا الَّذِىْ خَلَقَكُمْ وَالْجِبِلَّةَ الْاَوَّلِيْنَ ۝ (سورۂ شعراء پارہ ۱۹ رکوع ۱۴)

جب کوئی چیز ناپ کر دو تو پورا پورا دیا کرو اور نقصان پہنچانے والے، گھاٹے میں ڈالنے والے اور کم دینے والے نہ بنو۔ اور تم جب تولو تو ٹھیک ترازو سے تولو اور لوگوں کو ان کی چیزیں (جو وہ خریدیں) کم نہ دیا کرو اور روئے زمین میں فساد نہ پھیلاتے پھرو اور اس خدا سے ڈرو جس نے تمہیں اور اگلی مخلوق کو پیدا کیا"۔

ان آیات میں صاف طور پر اس حکم خداوندی کا اعلان فرمایا گیا ہے کہ لوگوں کے حقوق کا خیال رکھو اور خرید و فروخت کے معاملات میں بھی عدل و انصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ خریدنے والوں سے جسقدر قیمت لے رہے ہو اس کے مقابلہ میں جس مال کے پانے کا اُن کو پورا پورا حق حاصل ہے وہ انھیں دیدو اور اُن کے اس حق میں ذرّہ برابر کمی نہ کرو۔ چور بازاری کا مقصد ہی یہ ہے کہ قیمت زیادہ لی جائے اور مال حق سے کم دیا جائے اس لئے یہ عمل قطعاً غیر اسلامی اور غیر انسانی ہے اور چور بازاری کرنے والا اپنے اس عمل سے قرآن اور اسلام کے حکم کی کھلم کھلا خلاف ورزی کرتا ہے۔ معاشرہ کا مجرم ہے ضمیر کا مجرم ہے اور ساری انسانیت کا مجرم ہے۔

کفایت شعاری

کفایت شعاری سے مراد یہ ہے کہ آدمی اپنے خرچ اور اخراجات کو اپنی واقعی ضرورت اور حاجت سے زیادہ نہ بڑھائے اور اسی حد تک اخراجات کرے جو اس کی حیثیتِ عرفی اور زندگی کو برقرار رکھنے کے لیئے لازمی اور ضروری ہوں اس طرح کفایت شعاری کا معیار ہر شخص کی حیثیت کے مطابق الگ الگ مقرر ہوگا جس کا تعیّن وہ خود بھی کر سکتا ہے اور دوسرے لوگ بھی کر سکتے ہیں۔ یہ اخراجات اور مصارف کی درمیانی اور معتدل حد کا نام ہے جس میں نہ تو اِفراط ہو اور نہ تفریط ہو یعنی نہ اس میں کسی طرح کی زیادتی ہو اور نہ حد اعتدال سے کمی کی جائے۔ بلکہ کفایت شعاری تو اِس معتدل حد کی بھی بلند ترین صورت اور صفت کا نام ہے جس میں صرف ضروری اور انتہائی لازمی اخراجات مدنظر ہوں اور غیر ضروری اخراجات کا کوئی ہلکا سا رخ بھی نہ آنے پائے خواہ وہ حدودِ اعتدال میں

ظاہری طور پر داخل ہی کیوں نہ ہوں۔

غرض کفایت شعاری کسی شخص کے اخراجات میں اس انتہائی حدِ اعتدال کو کہتے ہیں جس میں غیر ضروری باتیں قطعی طور پر شامل نہ ہوں اور اتنی کمی بھی نہ کی جائے کہ یہ عمل بخل اور کنجوسی کی شکل اختیار کر لے۔ اور آدمی اپنے اخراجات کو ضروری حد سے بھی اس قدر کم کر دے کہ اس کی یا اس کے متعلقین کی زندگی صحت و تندرستی یا عزت و آبرو خطرہ میں پڑ جائے۔ زندگی انفرادی ہو یا اجتماعی دونوں حالتوں میں کفایت شعاری کا مفہوم یہی رہے گا کہ اخراجات ضرورت سے زیادہ نہ ہوں اور صرف اُسی قدر خرچ کیا جائے جس میں ضرورت پوری ہو جائے اور یہ میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ ضرورت کا تعیّن اپنی حیثیت کے مطابق ہر شخص کے لیئے الگ الگ ہوگا اسی کو ہم دوسرے لفظوں میں 'قناعت' بھی کہتے ہیں یعنی بقدرِ ضرورت چیز پر راضی رہنا اور زیادہ کی حرص و ہوس نہ کرنا اسلام نے جہاں بخل اور کنجوسی کی شدید مذمّت کی ہے وہاں اِسراف یعنی فضول خرچی سے بھی سختی کے ساتھ منع کیا ہے اور مسلمانوں کو ہدایت کی ہے کہ وہ اپنے مصارف اور اخراجات

ہیں میانہ روی سے کام لیں جس کی وجہ سے زیادہ قابل تعریف وہی صورت اور وہی حد ہے جسے ہم کفایت شعاری کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس صفت کے پیدا ہونے سے انسان پر نیکیوں کے دروازے کھل جاتے ہیں جبکہ کفایت شعاری اور قناعت نہ ہونے کی صورت میں حرص و طمع کے جذبات کی تولید ہوتی ہے جو رفتہ رفتہ انسانی نفس کی تمام خوبیوں کو فنا کر دیتے ہیں۔ اس کے دل میں خواہشات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور وہ اپنی تمام ذمہ داریوں اور فرائض کو بھول کر اپنی تمام عملی صلاحیتوں اور قوتوں کو اُن خواہشات کی تسکین کے لیئے وقف کر دیتا ہے مگر اُسے کسی وقت اور کسی صورت میں بھی تسکین نہیں حاصل ہوتی کیونکہ حرص اور طمع کی نہ کوئی حد ممکن ہے اور نہ خواہشات کی کوئی انتہا ہو سکتی ہے۔ اس بنا پر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس انسان کے مزاج میں جذبۂ قناعت و کفایت شعاری نہ ہو وہ کبھی مطمئن اور پر سکون زندگی بسر نہیں کر سکتا۔ اسے کتنی ہی دولت مل جائے، عیش و راحت کے کتنے ہی اسباب حاصل ہو جائیں لیکن اس کا نہ تھمنے والا جذبۂ طلب اور نہ رکنے والا ولولۂ حرص کبھی

کسی حد پر نہیں ٹھہرنے دے سکتا۔

قناعت اور کفایت شعاری میں اگر فرق کیا جا سکتا ہے تو بس اتنا کہ قناعت کا تعلق بنیادی طور پر صرف اس بات سے ہے کہ جو کچھ آدمی کو ملے اسی کو کافی سمجھے اور زیادتی کی ہوس نہ کرے اور کفایت شعاری یہ ہے کہ کم سے کم اس قدر خرچ کرے کہ اس کی ضرورت پوری ہو جائے اور اسی کو کافی سمجھے۔ ضرورت سے زیادہ اخراجات کو پھیلانے کی کوشش نہ کرے۔ حاصل دونوں کا ایک ہی ہے یعنی اپنی خواہشات کو صرف اسی حد تک محدود رکھے جہاں تک اس کی یا اُس کے متعلقین کی اصلی اور واقعی ضروریاتِ زندگی کا تعلق ہے۔ اس طرح ان دونوں ہی صورتوں میں وہ حرص و طمع کے تباہ کن نتائج سے محفوظ رہے گا۔ ایک روایت میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کی بارگاہ میں عرض کی کہ تیرے بندوں میں محتاج کون ہے اور غنی کون ہے۔ جواب ملا کہ میرے بندوں میں غنی تو وہ ہے جو فقط اپنی چیز پر راضی رہے جس سے اس کی ضرورت پوری ہو جائے اور محتاج وہ ہے جو اس کو کافی نہ سمجھے بلکہ زیادتی کی خواہش کرتا رہے۔

قناعت اور کفایت شعاری آپس میں مفہوم اور نتیجہ کے اعتبار سے ایک دوسرے کے اس قدر نزدیک ہیں کہ ان میں سے اگر ایک صفت کا وجود نہ ہو تو دوسری صفت کا وجود خود بخود ختم ہو جاتا ہے اس طرح کہ اگر کسی شخص کے دل میں جذبۂ قناعت موجود نہ ہو تو وہ کبھی کفایت شعاری پسند نہ کرے گا اور ہمیشہ فضول خرچی کرتا رہے گا۔ اور جس آدمی میں فضول خرچی کی عادت پائی جاتی ہو وہ کبھی قناعت نہیں کر سکتا اور کسی چیز کے ضرورت بھر مل جانے پر راضی نہیں رہ سکتا بلکہ ہمیشہ اسے حرص اور لالچ کا جذبہ زیادتی کی طلب اور مانگ پر ابھارتا رہے گا۔ پھر نتیجتاً دونوں ہی صورتوں میں ہمیشہ آدمی ہوس کا شکار بنا رہیگا اور کبھی اسے ذہنی سکون و اطمینان حاصل نہ ہو سکے گا۔ اُسے ہر وقت اور ہر لمحہ اس کی فکر ستاتی رہے گی کہ اور زیادہ حاصل کروں اور زیادہ سے زیادہ خرچ کروں جس کا انجام یہ ہوگا کہ اس کی نگاہوں سے حرام اور حلال کی تمیز بھی اُٹھ جائے گی۔ اور وہ طلبِ مزید یا فضول خرچی کے جذبہ کو تسکین دینے کے لیئے وہ تمام راستے اختیار کرے گا جو کسی طرح بھی اس کے لیئے ممکن

ہوسکیں گے۔ وہ لوگوں پر ظلم بھی کرے گا، ان کا استحصال بھی کرے گا، اُن کے حق مارے گا، قانون سے بچنے کے لیئے طرح طرح کے ہتھکنڈے اختیار کرے گا۔ نہ اُس کو حکومتوں کے قوانین کی پرواہ ہوگی اور نہ احکامِ خداوندی کی خلاف ورزی کا خوف رہے گا۔ نہ اُسے کسی کا پاس و لحاظ ہوگا، نہ اس کے دل میں کسی کی محبت ہوگی کیونکہ اس کو تو صرف ایک ہی فکر ہے کہ مجھے اور ملے با ہیں جو چاہوں اور جس طرح چاہوں فضول خرچی کرتا رہوں وہ غیر اللہ کی چاپلوسی اور خوشامد کرے گا، وہ ضمیر فروشی کرے گا، دوسروں کو خوش کرنے کے لیئے حرام اور خلاف انسانیت حرکتوں سے بھی اپنے آپ کو محفوظ نہ رکھ سکے گا۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کا ارشاد ہے کہ "اگر تم دنیا کے مال اور اس کی لذتوں اور نعمتوں میں سے صرف اس قدر حاصل کرنا چاہتے ہو جو تمہاری ضرورتوں کے لیئے کافی ہوجائے تو کم سے کم چیز بھی تمہارے لیئے کافی ہوسکتی ہے اور اگر تم بقدر کفایت چیز پہ راضی نہیں رہ سکتے اور زیادتی کی لالچ کرتے رہو گے تو یاد رکھو کہ پھر ساری

دنیا مجموعی طور پر بھی تمہارے جذبۂ حرص کو تسکین نہیں دے سکتی۔ بزرگانِ دین کی نصیحت ہے کہ کبھی ہمیں ان لوگوں کی طرف نہیں دیکھنا چاہیئے جو ہم سے زیادہ دولتمند اور ہم سے زیادہ اموالِ دنیا اور اقتدارِ دنیا کے مالک ہیں بلکہ ہمیں ان لوگوں کی طرف دیکھنا چاہیئے جو ہم سے ہر طرح کم حیثیت رکھتے ہیں تاکہ ہمارے دل میں حرص و طمع اور دوسروں پر حسد کرنے کے بجائے شکرِ الٰہی کا جذبہ بیدار رہو کہ اللہ نے ہمیں کس قدر نعمت عطا فرمائی ہے جبکہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو ہم سے ہزاروں درجہ زیادہ مصیبتوں اور پریشانیوں کا شکار ہیں۔ انسان اپنی زندگی میں کبھی راحت و سکون کا تصور بھی نہیں کر سکتا اگر وہ اپنے سے پست تر دکھی دنیا کے حال سے تو بے خبر رہے اور صرف اُن ہی لوگوں کی زندگی کو اپنی نگاہوں کے سامنے رکھے جو اس سے زیادہ دولتمند اور اس سے زیادہ فضول خرچ ہوں اس لیئے یقیناً سب سے بڑی دولتمندی یہی ہوگی کہ آدمی بقدرِ ضرورت چیز مل جانے پر قناعت کرے اور بقدرِ ضرورت خرچ کرنے پر اکتفا کرے اور راضی رہے۔

بلا شبہ اسلام ہی وہ دین ہے جس نے انسان کو
جہاں اس کی زندگی کے ہر شعبہ میں اعتدال اور میانہ روی
کے راستے بتائے ہیں وہاں اُس کے اقتصادی معاملات
اور مالی مسائل میں بھی وہی راہ بتائی ہے جو مستقیم اور
انتہائی معتدل ہے تاکہ وہ مالی معاملات میں بے راہ روی
سے ہلاک نہ ہو سکے اور افراد کے ساتھ پورا انسانی معاشرہ
مجموعی حیثیت سے فلاح و بہبود حاصل کر سکے ۔

(آیہ ۲۶/۲۷) سورۂ اسرا میں اللہ نے فرمایا ہے جس کا ترجمہ
یہ ہے " اور قرابت داروں اور محتاج اور پردیسی کو اُن کا حق
حق دو اور خبردار فضول خرچی نہ کرو کیونکہ فضول خرچی
کرنے والے یقیناً " اِخوانُ الشیاطین " یعنی شیطانوں
کے بھائی ہیں اور شیطان تو اپنے پروردگار کا بڑا ناشکرا
کرنے والا ہے " اس کا صاف مطلب یہی ہوا کہ جو لوگ
اپنے اخراجات میں اعتدال کی حد سے آگے بڑھ جاتے
ہیں وہ اللہ کی نہیں بلکہ شیطان کی پیروی کرنے والے
ہیں اور اللہ کے ناشکرے ہیں ۔ اسی سورہ میں اسی جگہ
کے قریب فرمایا گیا ہے ۔ ترجمہ ہے ۔ اور اپنا ہاتھ نہ تو اسقدر

سکیڑ لو کہ گویا وہ تمہاری گردن سے بندھا ہوا ہے اور نہ بالکل اُسے پھیلا ہی دو کہ سب کچھ خرچ کر ڈالو اور انجام یہ ہو کہ تم اِس طرح بیٹھے رہ جاؤ کہ لوگ تم کو ملامت بھی کریں اور حسرت و ناامیدی تمہیں گھیر لے۔" سورۂ اعراف میں فضول خرچی کو یہ فرما کر روکا گیا ہے۔ ترجمہ یہ ہے۔ اور کھاؤ پیو مگر فضول خرچی نہ کرو۔ بیشک اللہ فضول خرچی کرنے والوں کو دوست نہیں رکھتا (پ۸ ع۱۰) سورۂ فرقان میں اسراف اور فضول خرچی کی بُری عادت سے اس طرح منع فرمایا گیا ہے۔ ترجمہ یہ ہے۔ (خدائے رحمان) کے خاص بندے وہ ہیں کہ جس وقت وہ خرچ کرتے ہیں تو فضول خرچی نہیں کرتے اور نہ خرچ میں ضرورت سے زیادہ تنگی کرتے ہیں بلکہ ان کا خرچ اعتدال کے ساتھ ہوا کرتا ہے (پ۱۹ ع۴) ظاہر ہے کہ یہ تمام آیاتِ قرآنی ہمیں فضول خرچی سے روک رہی ہیں اور اس کی تعلیم دے رہی ہیں کہ ہم اپنے مصارف اور اخراجات میں پورے اعتدال اور کفایت شعاری سے کام لیں۔ نہ تو ہم کنجوس اور بخیل بن جائیں اور اپنے

بخل اور کنجوسی سے اپنی ذات، اپنے گھر والوں اور اپنے معاشرہ کو تباہ کر دیں اور نہ اس قدر فضول خرچ ہوں کہ ہم خود اور ہماری وجہ سے دوسرے بھی ہلاکت و رسوائی کے گہرے غار میں گر کر فنا ہو جائیں۔ اسلام نے اس طرح انسان کو زندگی کے تمام خطروں سے پوری طرح آگاہ کر دیا ہے اور وہ سیدھی راہ دکھا دی ہے جس میں اس کی ہر طرح کی فلاح و بہبود مضمر ہے۔ خواہ اس کی زندگی کا کوئی بھی شعبہ ہو، خوشی اور مسرت کے لمحات ہوں، شادی بیاہ کے مواقع ہوں، عیش و راحت کی محفلیں ہوں یا موت اور رنج و غم کے لمحے ہوں۔ کفایت شعاری، قناعت اور اعتدال پسندی کا اسلامی درس ہر جگہ کے لیئے ہے اور حقیقی مسلمان وہی ہے جو اپنی زندگی کے ہر موڑ پر اس اسلامی درس کو یاد رکھے۔

سرورِ انبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک حدیث میں ارشاد فرمایا ہے: مَنِ اقْتَصَدَ اَغْنَاهُ اللّٰهُ وَمَنْ بَذَّرَ اَفْقَرَهُ اللّٰهُ "جس شخص نے اپنے اخراجات میں

اعتدال کی راہ اختیار کی اُسے اللہ غنی کر دیتا ہے اور جس نے فضول خرچی کی اس کو وہ فقیر بنا دیتا ہے اسی طرح حضورؐ انورؐ نے فرمایا ہے۔ "مَا عَالَ مَنِ اقْتَصَدَ" یعنی وہ شخص کبھی پریشان حال نہ ہوگا جو اپنے اخراجات میں اعتدال کی راہ اختیار کرے گا۔

عدلِ اسلامی

عدل نام ہے انصاف اور میانہ روی کا اور ظلم اس کے خلاف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو بات قانونِ الٰہی کے مطابق جس طریقہ پر ہونا چاہیئے اُسی طرح انجام دینا عدل ہے اور اگر اس میں کسی قسم کی زیادتی اور کمی ہوگی تو یہ ظلم ہوگا قرآنِ کریم نے ظلم و عدل کے حدود کا اعلان فرما دیا ہے اور انسانی زندگی کے تمام شعبوں کا جابجا ذکر فرما کر ہمیں عدل کرنے اور ظلم سے بچنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ کہیں (بقرہ ۲۲۹) ارشاد فرمایا ہے: وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ۔ ظالم وہی لوگ ہیں جو خدا کی مقرر کی ہوئی حدوں سے تجاوز کرتے ہیں۔

اسلامی احکام اور مسلمان کی زندگی کا عدل سے بڑا گہرا تعلق ہے اگر نظریۂ عدل الگ کر دیا جائے تو پھر ہمارے پاس کیا رہ جائیگا جس سے ہم انسانیت کو اطمینان دلا سکیں گے اور اسے ظلم و جور سے بچا سکیں گے۔ (النحل ۹۰) ارشادِ الٰہی ہے: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ خدا انصاف اور نیکی کرنے کا حکم دیتا ہے۔ اور کہیں اس طرح کہا گیا

ہے: "اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی" (مائدہ ع ۲) انصاف سے کام کرو یہ بات پرہیزگاری سے بہت نزدیک ہے، انصاف کرنے والے انسان کا اِن الفاظ میں تذکرہ ہے: ومن یامر بالعدل الآیۃ کیا عدل کرنے والا اور دوسرے لوگ ایک دوسرے کے برابر ہیں؟ (النحل ع ۱۰) خدا نے انسان کیلئے جس دین کو مقرر اور پسند کیا ہے وہ دین اسلام ہے اور اس دین کی بنیاد ایک ایسے قانون پر ہے جس میں عدل وانصاف کے سوا کچھ نہیں قرآن مجید نے ہر شعبۂ زندگی سے بحث کی ہے اور اسے واضح کردیا ہے کہ اللہ کے نزدیک انسانی حیات کا کوئی شعبہ بھی نظریۂ عدل سے خالی نہیں ہوسکتا اور خدا کسی طرح بھی ظلم وجور کرنے والوں اور حدود سے آگے بڑھ جانے والوں کو دوست نہیں رکھتا۔ گھریلو زندگی ہو یا نجی اور ذاتی۔ اجتماعی حیات ہو یا غیر متمدن اور محض انفرادی، عدل ہر جگہ ضروری ہے کیونکہ عدل کے بغیر انسانی معاشرے کا نظم باقی نہیں رہ سکتا۔ ازدواجی زندگی ہی کو لے لیجئے اس میں بھی عدل و انصاف ضروری ہے۔ مرد کے حقوق واختیارات بھی مقرر ہیں اور عورت کے بھی۔ اِن میں سے ہر ایک کو ان حدود کے اندر رہنا چاہیئے جو اللہ نے اس کے لیے معین فرمادی ہیں یہ بھی عدل ہے اور اس پر عمل کرنا اور کاربند ہونا لازمی ہے۔ کسی شخص کی اولاد ہے اُن میں

بھی اسے انصاف کرنا ضروری ہے۔ کسی کے ساتھ بے جا رعایت کرنا اور دوسرے سے لاپرواہی کرنا درست نہیں ہے بلکہ ہر ایک کے ساتھ انصاف و عدل ضروری ہے۔

کسی کے نوکر ہیں ان کے ساتھ بھی عدل کرنا ضروری ہے جس قدر ایک آدمی سے کام لینا مناسب ہو اس سے اتنا ہی کام لینا چاہیئے اور اسے اس کے کام اور خدمت کا پورا معاوضہ دیا جائے، اگر کام زیادہ لیا گیا اور اجرت کم دی گئی تو ظلم ہو گا۔ عدل نہ رہے گا اور خدا کے مقرر کردہ حدود سے تجاوز ہو جائے گا جس کی اسلام نے اجازت نہیں دی ہے۔ یا کسی نوکر سے اس کی طاقت و قوت سے زیادہ کام لیا گیا جب بھی یہ عمل انصاف اور عدل اسلامی کے خلاف ہو گا اس لیئے عدل یہ ہے کہ نوکروں سے کام اتنا لیا جائے جس کی اُن میں طاقت ہو اور انھیں ان کے کام کی مناسب اور صحیح اجرت دی جائے۔ اسی طرح گھریلو اور نجی زندگی کے تمام شعبوں میں اسلامی نظریۂ عدل کارفرما ہے۔ ہمیں اُن تمام حدود اور اختیارات وحقوق کو سمجھنا چاہیئے تاکہ کوئی شخص نا سمجھی میں ہی سہی مگر کوئی ایسی بات نہ کر بیٹھے جو عدل کے خلاف ہو، ظلم ہو اور خدا کی ناراضی کا سبب ہو۔

اٹھنے بیٹھنے۔ بولنے اور چپ رہنے، کھانے، پینے۔ نیز ملکی اور

اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں میں عدل وانصاف سے کام لینا مسلمان کے لئے بے حد ضروری ہے ورنہ وہ سچا مسلمان نہیں ہے جو عدل سے کام نہیں لیتا کیونکہ اگر عدل نہیں تو پرہیزگاری نہیں اور اگر پرہیزگاری نہیں رہتی تو اسلام وایمان کی وہ بنیاد ہی ختم ہو جاتی ہے جس پر وہ قائم ہے۔

عدل وانصاف صرف یہی نہیں ہے کہ حکام رعایا سے جب کوئی معاملہ کریں تو ظلم نہ کریں اور جب فیصلہ کریں تو انصاف کا لحاظ کریں کسی پر زیادتی نہ ہو، کسی کا حق نہ مارا جائے کسی کو ناجائز طور پر اس کے حق سے زیادہ نہ دیا جائے اور ہر معاملہ میں بغیر کسی دباؤ کے، بغیر کسی لالچ کے بغیر کسی ذاتی رجحان اور خواہش کے صرف حقوق پر نظر رکھتے ہوئے جو انصاف چاہتا ہو وہ کریں اور جو عدل کہتا ہو اس پر عمل کریں۔ عام طور پر لوگ سمجھتے ہیں کہ عدالت صرف یہی ہے اور انصاف اسی چیز کا نام ہے۔ کہتے ہیں کہ فلاں شخص بڑا عادل ہے، بڑا انصاف پسند ہے۔ یعنی عدل و انصاف کے ساتھ فیصلے کرتا ہے۔ کسی کی بے جا رعایت نہیں کرتا۔ کسی سے مرعوب نہیں ہوتا، رشوت نہیں لیتا، خدا سے ڈرتا ہے اور عدل سے کام لیتا ہے۔ بے شک یہ بھی عدل ہے لیکن عدل کا مفہوم اس کی اسی قسم میں منحصر نہیں ہے بلکہ اسلامی عدل کا نظریہ اس سے زیادہ وسیع ہے۔ حاکم ہو یا محکوم، راعی ہو یا رعایا، آزاد ہو یا غلام، شوہر ہو یا

زوجہ، ماں باپ ہوں یا اولاد، تاجر ہو یا گاہک، آقا ہو یا غلام، ہمسایہ
ہو یا اجنبی، ملکی ہو یا غیر ملکی، انسان ہو یا حیوان زندگی کے ہر گوشہ میں
حیات کے ہر شعبہ میں، زندگی کے ہر موڑ پر مسائلِ عقل و تدبیر کے ہر قدم پہ
کاروانِ حیات کی ہر منزل میں اللہ کا حکم ہے کہ انصاف کیا جائے اور
عدل کو فراموش نہ ہونے دیا جائے۔ فیصلہ کرو تو **عدل** و انصاف کے
ساتھ: وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ" (النساء ۵/۶) جب تم
باہمی جھگڑوں کا فیصلہ کرنے لگو تو انصاف سے کیا کرو" اور جب عدالت
میں گواہی کا وقت آئے جب بھی عدل و انصاف کو فراموش نہ کرو
سچی گواہی دو چاہے وہ اولاد کے خلاف ہو یا ماں باپ یا کسی حاکم
کے۔ ایک طرف دولت کے انبار ہوں یا تلواروں کی جھنکار ہو یا تختہ
دار کی دھمکیاں ہوں لیکن گواہی دو تو سچی ہو اور ایک بے یار و مددگار
اور غریب و مفلس انسان کے متعلق بھی کچھ کہنا ہو تو وہی کہو جو حق ہو اور
عدل و انصاف کا اقتضا ہو۔ ارشادِ الٰہی ہے (نساء ۵/۴): يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰۤى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ"
"ایمان والو! مضبوطی کے ساتھ ایمان پر قائم رہو اور خدا لگتی گواہی دو
اگرچہ یہ گواہی خود تمہارے یا تمہارے ماں باپ یا قرابتداروں کے لئے
مضر ہی کیوں نہ ہو۔ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا" وہ مالدار

ہو یا فقیر خدا تو تمہاری بہ نسبت ان پر زیادہ مہربان ہے۔ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰی اَنْ تَعْدِلُوْا، "تو تم خواہشِ نفس کی پیروی نہ کرنا کبھی تم حق سے ہٹ جاؤ۔" دیکھئے گواہی دینے میں بھی انصاف اور عدل کا کس طرح حکم دیا گیا ہے۔ اس لئے جس طرح حاکموں کا فرض ہے کہ وہ عدل سے کام لیں سا تھ ہی اُن تمام لوگوں کا فرض ہے کہ وہ انصاف کریں جو عدالت سے متعلق ہیں یعنی فریقین اگر رشوت لینا بے انصافی ہے تو رشوت دینا بھی اسی طرح ظلم اور خلافِ عدل ہے اور یہ دونوں ہی خدا کے مجرم ہیں۔

اسی طرح کسی کی دشمنی میں حق کے خلاف کرنا اور محض اس لئے کہ کوئی ہمارا دشمن ہے اس کے معاملہ میں حدود سے تجاوز کرنا اور اس کے حق کو تلف اور برباد کرنا خلافِ عدل اور گناہِ عظیم ہے۔

(المائدۃ/۸) میں ہے: وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰۤى اَلَّا تَعْدِلُوْا۔ "تم کو کہیں کسی گروہ کی عداوت اس جرم میں نہ پھنسا دے کہ تم ناانصافی کرنے لگو۔ دیکھئے عدل کے حدود کس قدر وسیع ہیں اور ایک سچا مسلمان اپنے اور اپنے دشمن کے ساتھ بھی عدل و انصاف کا برتاؤ کرنے پر مجبور ہے ورنہ وہ مسلمان کہے جانے کا استحقاق نہیں رکھتا یہاں تک کہ اگر زبان سے کوئی بھی بات کہی جائے تو اس میں بھی عدل و

انصاف کے پہلو کو نظر انداز کرنا جائز نہیں ہے خواہ وہ گفتگو کسی کے مخالف ہو یا موافق ہو: وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ "جب بات کہو تو انصاف کے ساتھ اگرچہ وہ شخص جس کے خلاف تم کچھ کہو وہ تمہارا عزیز ہی کیوں نہ ہو۔ (انعام/۱۵۲)

حدیث میں ہے: قیامت کے روز اس شخص سے زیادہ کوئی مایوس نہ ہوگا جو دنیا میں عادل مشہور تھا مگر عمل کے لحاظ سے ظالم تھا اور انصاف نہ کرتا تھا۔

دوسری حدیث میں ہے: مَنْ عَامَلَ النَّاسَ فَلَمْ يَظْلِمْهُمْ وَحَدَّثَهُمْ فَلَمْ يَكْذِبْهُمْ وَوَعَدَهُمْ فَلَمْ يُخْلِفْهُمْ فَهُوَ مِمَّنْ كَمُلَتْ مُرُوَّتُهُ وَظَهَرَتْ عَدَالَتُهُ وَوَجَبَتْ أُخُوَّتُهُ وَحَرُمَتْ غِيْبَتُهُ۔ "جس شخص نے لوگوں کے معاملات میں ظلم سے کام نہ لیا اور کسی سے جھوٹی بات نہ کہی وعدہ کے خلاف نہ کیا، اس کی عدالت اس کی اس صفت سے ظاہر ہو جائے گی اور شرافت و بلندیِ نفس آشکار ہو گی۔ ایسے انسان کی دوستی اور اخوت واجب اور بدگوئی حرام ہے۔

غرض انسان کی زندگی کے ہر شعبہ میں عدالت ضروری ہے اور اس کے اجتماعی رشتوں کے ہر پہلو میں نظریۂ عدلِ اسلامی ناگزیر ہے۔ اور جس طرح ارکانِ سلطنت اور حاکموں کے دربار و

میں عدل و انصاف ضروری ہے۔ بالکل اسی طرح غریبوں اور فقیروں کی جھونپڑیوں میں بھی قانون عدل اسلامی اسی طرح کارفرما ہے اور جس طرح ججوں کی کرسیوں اور ان کے قلم سے مطالبۂ عدل وابستہ ہے اسی طرح مزدوروں، نوکروں اور تمام زیردست لوگوں، ان کے آقاؤں اور سرپرستوں سے بھی اسی شدت کے ساتھ انصاف طلبی اور عدل نوازی کا مطالبہ موجود ہے اور جس طرح انسان کے اجتماعی روابط میں ہر جگہ بغیر عدل کے اسلامی زندگی کا تصور ہی پیدا نہیں ہو سکتا بالکل اسی طرح اسکی ذاتی گھریلو اور نجی زندگی میں بھی قدم قدم پر مطالبۂ عدل و انصاف کی گونج موجود ہے، کیونکہ اللہ ظالم نہیں ہے، وہ یقیناً عادل ہے اور اپنے بندوں کی زندگی کو بھی عدل و انصاف کی بہترین مثال بنانا چاہتا ہے۔

مثالی معاشرہ

اسلام نے جس معاشرہ کی بنیاد ڈالی ہے وہ یقینی طور پر ایک "مثالی معاشرہ" ہے اور اگر ہم اُس معاشرتی نظام پر پوری طرح عمل کریں جو اسلام کے ذریعہ سے ہمیں ملا ہے تو دنیا کا کوئی معاشرہ ہمارے مقابلہ میں نہیں آسکتا۔ انسان کی زندگی تمدن کی محتاج ہے اور بغیر دوسرے انسانوں کے ساتھ میل جول کے وہ زندہ نہیں رہ سکتا اور نہ کسی قسم کی ترقی کر سکتا ہے۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے سب ہی جانتے ہیں لیکن اس تمدنی زندگی کو کس طرح کامیاب بنایا جائے اور کون سا ایسا نظامِ زندگی ہے جس کے اندر رہ کر انسان تمدن کے اعلیٰ مقاصد کو حاصل کر سکتا ہے، اس مسئلہ کا مکمل حل صرف اسلام نے بتایا ہے۔

دوسری قوموں نے بہت سے نظام بنائے مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے اور اس کی بڑی وجہ یہی تھی کہ نظام بنانے والوں کی فکر نسلی و قومی اور دوسری عصبیتوں سے آزاد نہ تھی۔ اسلام انسانی

فکر کی تخلیق سے بلند ہے وہ اللہ کا مقرر کیا ہوا دین ہے، وہ ایک ایسا نظام زندگی ہے جسے انسان نے نہیں بلکہ خالقِ انسان نے بنایا ہے اس لئے اِس میں کسی قسم کی بھی عصبیّت کا وجود ممکن ہی نہیں ہو سکتا۔

معاشرہ اُس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک اُس میں امن و اماں نہ ہو، ہر ایک کی جان و مال کا پورا تحفظ نہ ہو، ایک دوسرے کے حقوق کا پاس و لحاظ نہ رکھے، ہر فرد کیلئے ترقی کی راہیں کھلی ہوئی ہوں۔ ظلم و جور کی ہمت افزائی نہ ہو اور ہر شعبۂ زندگی میں عدل و انصاف کا دور دورہ ہو۔ قانون کی پابندی سزا کے خوف سے نہیں بلکہ دل سے کی جائے۔ اور پوری سچائی اور پورے خلوص کے ساتھ قانون کا احترام کیا جائے اور ہر انسان کے دل میں دوسرے انسانوں کا پاس و لحاظ ہو۔ قرآن حکیم نے اِسی بنیادی چیز کو "اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ" کہہ کر بتایا ہے یعنی اہلِ ایمان ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ ظاہر بات ہے کہ اصولی طور پر ایک بھائی کو دوسرے بھائی کی ہر خوشی اور ہر غم کو اپنی خوشی اور اپنا غم سمجھنا چاہیئے۔ اس طرح جب پورا اسلامی معاشرہ اخوّت اور برادرانہ رشتوں میں جکڑ جائے گا تو پھر ظلم و زیادتی کا

وجود ہی نہیں رہ سکتا۔ سرورِ کائنات صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کا ارشاد ہے "اَلْمُسْلِمُ اَخُو الْمُسْلِمِ" ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے۔ اور کبھی اس طرح فرمایا "کُلُّکُمْ مِنْ اٰدَمَ وَ اٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ" تم سب کے سب حضرت آدمؑ کی اولاد ہو اور حضرت آدمؑ مٹی سے بنے تھے۔ تم میں نہ کوئی بڑا ہے نہ چھوٹا۔ نہ عرب کو غیر عرب پر فضیلت حاصل ہے اور نہ غیر عرب کو عرب پر۔ نہ گورا کالے سے افضل ہے اور نہ کالا گورے سے بہتر ہے، فضیلت جو کچھ ہے وہ صرف عمل سے ہے۔ اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہی انسان ہے جو عمل کے اعتبار سے بہتر ہو، چاہے وہ فقیر ہو یا امیر ہو، محکوم ہو یا حاکم ہو، بڑا ہو یا چھوٹا ہو، کسی خطّۂ زمین کا رہنے والا اور کسی نسل سے اور کسی قبیلہ یا فرقہ سے تعلق رکھتا ہو۔ اور کوئی سی بھی زبان بولتا ہو۔ حضورِ انور نے فرمایا ہے: "اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِہٖ وَ یَدِہٖ" اصلی اور حقیقی مسلمان وہی ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے اس کے دوسرے مسلمان بھائی محفوظ رہیں اور کبھی یوں بھی فرمایا ہے: "اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ النَّاسُ مِنْ لِّسَانِہٖ وَ یَدِہٖ" حقیقی مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے

انسانی افراد محفوظ رہیں۔ اس حفاظت کا مفہوم اور دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ اس کے اندر انسانی زندگی کا ہر ایک پہلو آجاتا ہے جس کا تعلق فرد سے ہو یا پورے معاشرہ سے ہو۔ بیشتر باہمی جھگڑے مال و دولت کی وجہ سے ہوا کرتے ھیں۔ قرآن حکیم نے ایک کلیہ بنا دیا "وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ" اپنے مال و دولت کو غلط اور حرام طریقوں سے استعمال نہ کرو۔ (آیہ بقرۃ ۱۸۸) اس میں مال و دولت کے حاصل کرنے، جمع رکھنے اور صرف کرنے کے تمام پہلو آگئے یعنی ہماری دولت کسی شکل میں بھی ہو اور منقولہ ہو یا غیر منقولہ۔ ہمیں اس کی تحصیل، اس کا مصرف اور اس کا استعمال صرف اُن ہی طریقوں سے کرنا چاہیے جو اللہ کے مقرر کئے ہوئے ہیں اور جو اسلامی عدل و انصاف کے تقاضوں سے بھرپور مطابقت رکھتے ہوں۔ اگر تمام مالی معاملوں میں ہم عدل و انصاف کے تقاضوں کو پیشِ نظر رکھیں اور خود غرضی اور بے اعتدالی کو اپنے قریب نہ آنے دیں تو کبھی آپس میں جھگڑے نہیں پیدا ہو سکتے اور کبھی معاشرہ کا امن و سکون ذرہم برہم نہیں ہو سکتا۔

اسلام نے مسلمانوں کو ایثار کی تعلیم دی ہے جس کا
مطلب یہ ہے کہ ہر شخص اپنی ضرورت پر دوسرے کی ضرورت کو
مقدم رکھے۔ اس سے زیادہ معاشرہ کی اصلاح، اس کی ترقی،
اس کے افراد کی ہم آہنگی اور یگانگت اور باہمی میل جول پیدا
کرنے کے لئے اور کون سی مؤثر تدبیر ممکن ہو سکتی ہے۔ اسلام
نے مسلمانوں کو صرف آپس ہی میں میل جول اور محبت اور باہمی
تعاون کی تعلیم نہیں دی ہے بلکہ اس نے تو یہاں تک کہا ہے
"اَلْخَلْقُ كُلُّهُمْ عِيَالُ اللّٰهِ وَاَحَبُّهُمْ اِلَى اللّٰهِ اَنْفَعُهُمْ لِعِيَالِهٖ (حدیث بیہقی)
تمام مخلوقات گویا اللہ کا کنبہ ہے اور اس کے نزدیک اس
کی مخلوق میں سے سب سے زیادہ محبوب وہی ہے جو اس کے
کنبے کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچائے۔
سب جانتے ہیں کہ اللہ کا کنبہ نہیں ہے۔ وہ ان چیزوں
سے پاک اور منزّہ ہے مگر حدیث میں اللہ کی مخلوق کو
اس کا کنبہ اس لئے کہا گیا ہے کہ وہ اپنی مخلوق سے محبت
فرماتا ہے۔ اور جس طرح لوگ اپنے کنبے اور اپنی اولاد یا گھر والوں
سے الفت و محبت رکھتے ہیں اس سے کہیں زیادہ اللہ اپنی
مخلوق سے محبت کرتا ہے تو پھر یہ بات کسی طرح بھی ممکن

نہیں ہو سکتی کہ وہ مردِ مؤمن جو اپنے خالق کی ذات سے بے پناہ محبت رکھتا ہو، وہ اللہ کی مخلوق سے محبت نہ کرے اس لئے سچے مسلمان کی یہ پہچان ہے کہ وہ کسی کو بھی نقصان پہنچانے کی کوشش نہ کرے اور اس کی پوری زندگی پوری کائنات کے لئے پیغامِ محبت بن جائے۔

انفرادی اور اجتماعی اخلاق کا کونسا ایسا رخ ہے جس کی اسلام نے تعلیم نہیں دی ہے۔ اگر کسی غیر کے سامنے مسلمانوں کو اپنے عقائد اور خیالات ظاہر کرنے کا موقع حاصل ہو یا کسی قسم کی بھی گفتگو کیوں نہ ہو، اسلام کی سختی کے ساتھ ہدایت ہے کہ بڑے حُسن اور نرمی کے ساتھ بات چیت کی جائے اور کوئی ایسی بات نہ کہی جائے جس سے دوسرے شخص کے دل کو تکلیف پہنچے۔ اسی چیز کی تعلیم دیتے ہوئے اللہ نے قرآن حکیم میں فرمایا ہے: "وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا" (بقرہ ۸۳) یعنی جب کسی سے بات کرو تو ہمیشہ بھلے طریقہ سے کرو۔ اس جگہ اس کی کوئی شرط نہیں ہے کہ گفتگو اپنے ہم عقیدہ سے ہو یا کسی دوسرے سے بلکہ مخاطب کوئی بھی ہو اُس سے حُسن اور نرمی کے ساتھ بات چیت کرو۔

قرآن حکیم نے اسی تعلیم کی طرف حضرت موسیٰ کے

واقعات کے سلسلے میں بھی یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ اے موسیٰ اور ہارون تم دونوں جب فرعون کی ہدایت کے لئے اس کے پاس جانا تو اس سے بڑی نرمی اور حسنِ اخلاق کے ساتھ بات کرنا تاکہ وہ تمہارے اخلاق سے متأثر ہو کر تمہاری گفتگو کو ٹھنڈے دل سے سُن سکے۔ (طٰہٰ ۴۴)

اسی طرح کا یہ ارشاد بھی ہے "اُدْعُ اِلیٰ سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ" (سورۂ نحل ۱۲۵) اے رسول تم اپنے پروردگار کے راستے کی طرف لوگوں کو حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ سے بلاؤ اور ان سے بحث بھی کرو تو ایسے طریقہ سے جو بھلا ہو۔ (سورۂ حٰم السجدۃ ۳۴) میں اس طرح فرمایا گیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے: نیکی اور برائی آپس میں برابر نہیں ہیں۔ تم نیکی سے برائی کو دفع کر دیا کرو تو اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ جس شخص کے اور تمہارے درمیان عداوت ہو گی وہ تمہاری اس نیکی سے ایسا ہو جائے گا۔ جیسا کوئی مخلص دوست ہوا کرتا ہے۔ (آیہ ۱۰۸) سورۂ انعام میں یہ فرمانِ خداوندی ہے: وَلَا تَسُبُّوا

الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ فَیَسُبُّوا اللّٰہَ عَدْوًاۢ بِغَیْرِ عِلْمٍ ؕ اے مسلمانو! تم ان کو گالیاں نہ دیا کرو جنھیں غیر مسلم لوگ اللہ کے سوا پکارتے ہیں کیونکہ اگر تم انہیں گالی دو گے تو اس کے بدلے میں وہ لوگ انتقام کے جذبہ میں اللہ کو گالی دیں گے اپنی جہالت کی وجہ سے اور اُن کی اس گستاخی اور بے ادبی کا تم خود ہی سبب بن جاؤ گے۔ اس لئے بجائے اس کے کہ دوسروں کو گالی دی جائے اور ان سے بداخلاقی اور نفرت وحقارت کے ساتھ خطاب کیا جائے۔ محبت، خوش اخلاقی اور بھلے انداز میں گفتگو ہو تو محبت میں اضافہ ہوگا اور اگر پہلے سے دشمنی و عداوت ہوگی تو دل صاف ہو جائیں گے اور عداوت، محبت میں تبدیل ہو جائے گی۔

سرورِ کائنات کی پوری زندگی محبت کا ایک مکمل سبق تھی، اہلِ بیتِ اطہار اور صحابہ کرام رضی محبت وخلوص کا نمونہ تھے اور اسلام کا لفظ ہی "مسلم"

سے بنا ہے جس کے معنی صلح اور امن کے ہیں یعنی یہ ایک ایسا دین ہے اور ایسا معاشرتی نظام ہے جس میں بدامنی نہیں ہو سکتی اور جس میں فساد اور انتشار کا تصور تک ممکن نہیں ہے۔ اگر اس کی تعلیمات پر بھرپور عمل ہو۔ حضورؐ انور نے فرمایا ہے "اے اللہ کے بندو! تم سب آپس میں سگے بھائیوں کی طرح ہو" اور دوسروں کے لئے وہی ایسی باتیں پسند کیا کرو جو خود اپنے لئے پسند کرتے ہو۔ سب سے بہتر وہ آدمی ہے جو انسانوں کی سب سے زیادہ خدمت کرے۔ جو شخص عصبیت سے کام لے گویا اس نے ایمان کا طوق اپنے گلے سے اتار کے پھینک دیا۔

قرآن حکیم نے اس کا اعلان کیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے "جس شخص نے ایک آدمی کو ناحق قتل کر ڈالا اُس نے گویا تمام انسانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ (مائدۃ ۵/۳۲)

وہ نظامِ زندگی جو ہر ایک انسان کی جان کو

پوری انسانی نسل کی جانوں کے برابر قیمتی سمجھتا ہو اُس
سے بڑھ کر کون سا معاشرتی نظام ہو سکتا ہے اور
اس معاشرے سے بڑھ کر جہاں ایک آدمی کی زندگی
دنیا بھر کے تمام انسانوں کی زندگیوں کے برابر عزت
و قیمت رکھتی ہے ۔ کون سا مثالی معاشرہ ہو سکتا ہے
سوائے اسلام کے ۔

حیاداری

حیاداری انسانی صفتوں میں ایک بنیادی اور پیدائشی حیثیت رکھتی ہے اور اس سے انسان کی بہت سی خوبیاں اور نیکیاں وابستہ ہیں۔ دوسرے لفظوں میں اُن خوبیوں اور نیکیوں کا اصلی سرچشمہ یہی حیا و شرم کی صفت ہے۔ یہی وہ صفت ہے جس سے گناہوں اور برائیوں سے بچنے کی عادت پڑتی ہے اور اسی سے تقویٰ اور پرہیزگاری کی تخلیق اور پرورش ہوا کرتی ہے۔ اسی طرح تمام احکامِ الہٰی پر عمل پیرا رہنے میں بھی حیا کی صفت کو بڑا دخل ہے وعدہ کی وفا، امانت میں خیانت نہ کرنا، نیک کاموں میں حصہ لینا۔ اپنے بدن اور ماحول کو صاف ستھرا رکھنا، اولاد کو مناسب تربیت دینا اور اچھے ادب و اخلاق کی تعلیم دینا، اسی طرح خوش خلقی اور ادب و تہذیب کے ساتھ باہم ایک دوسرے سے ملنا جلنا پھر ایسا کوئی کام نہ کرنا

جو اپنی یا اپنے گھر اور خاندان والوں یا اپنے دین اور معاشرے کی بدنامی اور رسوائی کا سبب ہو۔

یہ سب باتیں حیا کے جذبہ ہی سے تعلق رکھتی ہیں۔ غرض اگر انسان میں حیا کا جذبہ باقی ہو تو وہ بہت سی نیک عادتیں اور اچھی صفتیں آسانی سے حاصل کر سکتا ہے اور اگر حیا موجود نہ ہو تو پھر اس کے لئے ہر برائی کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ اسی کی طرف حدیث میں ان لفظوں سے اشارہ کیا گیا ہے: **اِذَا لَمْ تَسْتَحْیِ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ**" اگر تم میں حیا و شرم نہیں ہے تو پھر جو چاہو کرو یعنی نیکی اور بدی میں حیا ایک قانونی حد ہے تو جب یہ حد اور رکاوٹ ہٹادی جائے ایسی صورت میں انسان کو پھر برائی سے کون سی چیز روک سکتی ہے کیونکہ بے حیا اور بے شرم انسان کی نگاہوں میں کسی بات میں برائی کا پہلو باقی ہی نہیں رہتا۔

علم اخلاق کے جاننے والوں نے حیا کی تعریف اس طرح کی ہے کہ یہ انسانی نفس کی ایسی روِش اور عادت کا نام ہے

جس کی وجہ سے وہ قبیح اور بری باتوں کو ناپسند کرتا ہے اور اچھی باتوں کو پسند کرتا ہے اس بنا پر کہ اچھی باتیں قابلِ تحسین و تعریف ہیں اور بری باتیں لائق ملامت و سرزنش ہیں۔ اس صفت کی نسبت پورے کمال کے ساتھ جس ذات اقدس و اعلیٰ کی طرف ہے وہ خود ذاتِ الہٰی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ جس قدر اور جس حقیقت کے برے کام ممکن ہو سکتے ہیں اُن سب سے اُس نے اپنی مخلوق کو روک دیا ہے اور اپنے بندوں پر انہیں حرام یا مکروہ قرار دیا ہے اور اُن ہی کاموں کے کرنے کی اجازت دی ہے جو اچھے اور لائقِ تعریف ہیں اور جہاں کہیں قرآن حکیم میں اس کا ذکر ہے کہ اللہ فلاں بات سے حیا نہیں کرتا وہاں مراد یہی ہے کہ جو باتیں اچھی اور حق ہیں اُن کا بندوں کو حکم دینے اور انہیں تعلیم دینے میں وہ کسی کو بھی پروا نہیں کرتا۔ اسی بات کی طرف سورۂ بقرہ[۲۶] میں اللہ کا یہ ارشاد اشارہ کر رہا ہے: اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَحْیٖٓ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَۃً فَمَا فَوْقَھَا۔ یعنی اللہ اس بات سے نہیں شرماتا کہ وہ مچھر

یا اُس سے بھی چھوٹی کسی چیز کی مثال دے کر حقایات
کی تعلیم دے اور اس کی وضاحت کرے بلکہ وہ حق بات
بیان کرنے میں ہر وہ مثال دیتا ہے اور ہر وہ طریقہ
اختیار کرتا ہے جو ضروری اور مناسب ہو چاہے لوگ
اُس مثال اور اُس طریقہ کو کتنا ہی ناپسند کریں۔

اسی سلسلہ میں سرورؐ کائنات کی ایک حدیث میں ہے
جس کا خلاصہ یہ ہے کہ صاحب عزت و جلال اللہ کے
سامنے جب اس کا کوئی بندہ اپنے دونوں ہاتھ پھیلاکر
کچھ بھلائی مانگتا ہے تو وہ اُس بندہ کو اپنی بارگاہ سے
محروم کرنے پر شرم کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں اللہ
کی شرم و حیا سے مراد وہ کیفیت اور حالت یا
جذبہ نہیں ہے جو انسانی نفس میں پیدا ہوتا ہے کیونکہ
اللہ کی ذات کیفیات اور جذبات سے پاک اور
برتر ہے بلکہ یہی مراد ہے کہ وہ اپنی بخشش و عطا
سے کسی سائل کو محروم و مایوس نہیں کرتا جو اُس
کا واقعی مستحق ہو۔

جہانتک جذبۂ حیا کے وجود کا تعلق ہے اسکے متعلق

ابھی عرض کیا جا چکا ہے کہ یہ انسان کی ایک پیدائشی
صفت ہے اور اللہ نے اس صفت اور اس جذبہ کو
اس کی فطرت و خلقت میں شامل کر دیا ہے لیکن اس کے
ساتھ ہی یہ بات بھی ظاہر ہے کہ انسان اپنی اس پیدائشی
صفت اور جذبہ کو غلط تربیت اور غلط ماحول سے متأثر
ہو کر غلط طور پر استعمال بھی کر سکتا ہے اور یقیناً اس کے
بے محل استعمال سے نتائج بھی اچھے نہیں نکل سکتے
اور یہ بات پوری طرح ممکن ہے کہ حیا اور شرم کے
غلط استعمال سے انسان دنیا اور آخرت کی ہر اچھائی
سے محروم ہو کر رہ جائے۔ اس بنا پر یہ ضروری
ہے کہ اللہ کے عطا کئے ہوئے اس جذبہ کا استعمال
بھی درست طریقہ پر ہو اور اس صفت کی تربیت
ایسے ماحول میں ہو جس کے اثر سے اس میں بے
اعتدالی پیدا نہ ہونے پائے۔ بلاشبہ یہ غلط ماحول
اور غلط استعمال اس جذبہ کو برائیوں کا سبب بھی
بنا سکتا ہے اور کبھی اسے بالکل فنا بھی کر سکتا ہے
اسلام نے ہمیں اس خطرے سے خبردار کیا ہے اور

اس صفت کے صحیح استعمال اور اس کی صحیح و معتدل تربیت کی تعلیم بھی دی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے انسان کے لئے وہ تمام باتیں ممنوع کردی ہیں جن سے اُس کے جذبۂ حیا کو ٹھیس لگتی ہو اور بے حیائی و بے شرمی کو مدد ملتی ہو۔

حیاداری کے ان غلط اور صحیح پہلوؤں کی طرف سرورِ کائنات کی ایک حدیث میں ان لفظوں کے ساتھ اشارہ کیا گیا ہے: اَلْحَیَاءُ حَیَاءَانِ حَیَاءُ عَقْلٍ وَحَیَاءُ حُمْقٍ فَحَیَاءُ الْعَقْلِ ھُوَ الْعِلْمُ وَحَیَاءُ الْحُمْقِ ھُوَ الْجَھْلُ۔ یعنی حیا کی دو قسمیں ہیں ایک ممدوح ہے اور دوسری لائقِ مذمت۔

قابلِ مدح و تعریف صرف وہ حیا ہے جو اُن باتوں کے عمل میں لانے سے ہو جنہیں عقلِ سلیم اور شرع بُرا قرار دے اور جو واقعی طور پر لائقِ مذمت ہوں رہی وہ حیا جو قابلِ تعریف نہیں ہے وہ یہ ہے کہ آدمی ایسی باتوں سے شرم کرے جو عقل و شرع کے

نزدیک کسی قسم کی بھی برائی نہیں رکھتیں اور ہر طرح درست بلکہ ضروری ہیں مگر کچھ لوگ اپنی جہالت و بے علمی کی وجہ سے انہیں برا سمجھتے ہیں جیسے کوئی جاہل آدمی علمی مسائل سے ناواقفیت کے باوجود اُن کے جاننے والوں سے انہیں اس لئے نہیں دریافت کرتا کہ اُسے اس بات سے حیا آتی ہے کہ خود وہ لوگ بھی اور دوسرے بھی کہیں گے کہ یہ شخص ان مسائل سے بے خبر ہے۔ اس شرم کی وجہ سے وہ اپنی جہالت کو باقی رکھتا ہے اور صحیح معلومات حاصل نہیں کرتا۔ بہت سے لوگ نماز، روزہ اور دوسری شرعی باتوں کے حکم نہیں جانتے اور شرم کی وجہ سے کسی سے پوچھتے بھی نہیں اسی طرح غَلَط الفاظ بولتے رہیں گے یا آیتوں اور حدیثوں کو غلط پڑھتے رہیں گے لیکن کسی جاننے والے کے ذریعہ سے اپنی اصلاح نہیں کرینگے کیونکہ انہیں اس سے شرم آتی ہے کہ کسی کے سامنے اپنی غلطی کا اظہار اور اعتراف کریں اور اس طرح وہ ہمیشہ جہالت کے اندھیرے میں پھنسے رہتے ہیں اور ہر قسم

ترقی اور کامیابی سے محروم رہا کرتے ہیں۔ اسی طرح بعض لوگ اپنا کوئی خاص مرض بیان کرنے میں شرم کرتے ہیں اور اس کا علاج نہیں کرتے اور اس شرم کے نتیجہ میں آخر وہ اپنی زندگی ہی سے محروم ہو جاتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ ایسی شرم وحیا کبھی قابلِ تعریف نہیں ہوسکتی ــــ ایک حدیث میں ہے۔ مَنْ رَقَّ وَجْهُهٗ رَقَّ عِلْمُهٗ" اس کا مفہوم یہ ہے کہ جو شخص علم حاصل کرنے میں اور ضروری باتوں کے دریافت کرنے میں شرم کرے گا کبھی اس کو علم حاصل نہ ہوسکے گا اور وہ ہمیشہ جاہل ہی رہے گا۔

اسی بات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ایک حدیث میں آیا ہے: نِعْمَ النِّسَآءُ نِسَآءُ الْاَنْصَارِ لَمْ يَكُنْ يَمْنَعُهُنَّ الْحَيَاءُ اَنْ يَّتَفَقَّهْنَ فِي الدِّيْنِ" مدینہ کے انصار کی عورتیں کس قدر اچھی ہیں کہ وہ احکامِ شرع دریافت کرنے میں شرم نہیں کرتیں۔

بعض امور ضرور ایسے بھی ہیں جنہیں بیان کرنے میں اور جن کے تفصیلی احکام معلوم کرنے میں ایک کو

دوسرے سے شرم آتی ہے اور اس شرم و حیا کی وجہ سے آپس میں صاف صاف گفتگو نہیں کی جاسکتی۔ ایسی شرم ہرگز قابل مذمت نہیں ہے لیکن جاہل رہنا بھی درست نہیں اس لئے اس قسم کی باتوں کو معلوم کرنے کیلئے ایسے طریقے اختیار کئے جاسکتے ہیں جن سے معلومات بھی ہو سکیں اور شرم و حجاب بھی باقی رہے مثلاً لکھ کر اور اپنا نام ظاہر کئے بغیر ایسے امور کو دریافت کیا جائے یا ادب و تہذیب کے ساتھ مجمل لفظوں میں اپنے مطلب کا اظہار کیا جائے اسی طرح کے بہت سے طریقے ممکن ہیں جن سے ایسے موقعوں پر مدد لی جاسکتی ہے لیکن اگر شرم و حیا کی وجہ سے ضروری مسائل کو دریافت ہی نہ کیا جائے تو ایسی شرم و حیا یقیناً قابلِ مذمت ہو گی بلکہ پوری طرح ممکن ہے کہ یہ انسان کو گمراہ کر دے اور انفرادی و اجتماعی بربادی کا سبب بن جائے اس گفتگو سے اس بات کی پوری وضاحت ہو جاتی ہے کہ حیا دو طرح کی ہوتی ہے۔ کبھی وہ قابلِ تعریف ہے تو کبھی قابلِ مذمت۔ قابل تعریف وہ حیا ہے جو ایسے محل پر ہو جس کی اجازت اور جس کا جواز عقل و شرع

کے نزدیک ثابت ہے اور لائقِ مذمّت وہ حیا ہے جو بے محل ہو اور عقل و شرع سے اس کا جواز ثابت نہ ہوسکے اور جس کی وجہ سے انسان علمی، سماجی، اقتصادی اور ہر طرح کی انفرادی اور اجتماعی ترقیوں اور برکتوں سے محروم ہو جائے۔

اسی لئے حدیث میں آیا ہے کہ حیا اور ایمان دونوں ایک رشتے میں منسلک ہیں یعنی جہاں ان میں سے ایک ہوگا وہاں دوسرا بھی ہوگا۔ اور کبھی یہ فرمایا گیا ہے کہ "اَلْحَیَاءُ مِنَ الْاِیْمَانِ" یعنی حیا ایمان کا جزو ہے۔ دوسری حدیث میں ہے "لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَا حَیَاءَ لَہٗ" جس شخص میں حیا نہیں ہے، اس میں ایمان کا وجود ہی نہیں۔

خلاصہ یہ ہوا کہ شرم و حیا کے پیدائشی جذبہ کو اُن حدود میں رکھنا جو عقل و شرع کے نزدیک درست ہوں، سچے ایمان کی علامت ہے اور جس آدمی میں حیا کا یہ جذبہ موجود ہوگا وہ گناہوں اور برائیوں سے ہمیشہ نفرت کرے گا اور کبھی کوئی ایسا

کام نہیں کرے گا جس سے اس کے نفس اور کردار پر بے شرمی اور بے حیائی کا دھبّا لگ سکے۔

نیکی نجات کا راستہ ہے

سب سے بیشتر ہمیں یہ بات معلوم ہونا چاہیئے کہ قرآن حکیم کے نزدیک نیکی کا مفہوم کیا ہے اس کے بعد خود بخود یہ حقیقت بھی پوری طرح صاف ہو جائے گی کہ نجات اور فلاح کا راستہ نیکی کے سوا کوئی دوسرا ممکن نہیں ہو سکتا۔ نیکی کے لئے ایک صاف اور واضح لفظ جو قرآنِ پاک میں بولا گیا ہے وہ "بِرّ" ہے اور کبھی نیکی کو معروف اور عُرف، حُسنہ اور احسان اور خیر کے لفظوں کے ساتھ بھی ذکر کیا گیا ہے۔

محدثین اسلام نے لفظ "بِرّ" کی تشریح میں ملتے جلتے لفظوں کے ساتھ اس طرح لکھا ہے "اَلْبِرُّ اِسْمٌ جَامِعٌ لِکُلِّ طَاعَۃٍ وَّعَمَلِ الْخَیْرِ" "بِرّ" یعنی نیکی ایک ایسا جامع اسم ہے جس میں ہر اچھا کام اور اللہ کی ہر طرح کی عبادت و بندگی شامل ہے۔ اہل لغت اور محدثین و مفسرین سب ہی اس بات پر متفق ہیں کہ "بِرّ" کا لفظ اُن تمام اچھائیوں پر مشتمل ہے جن سے تقرب بارگاہِ خداوندی کا حصول ہو سکتا ہو قرآنِ حکیم میں سورۃ بقرہ کے بائیسویں رکوع کی ابتدا میں اللہ نے "بِرّ"

یعنی نیکی کے مفہوم کی تفصیل اس طرح بیان فرمائی ہے: لَیْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَ الْمَغْرِبِ وَ لٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ، الآیۃ پوری آیت کریمہ کا ترجمہ یہ ہے: یہ نیکی نہیں ہے کہ تم فقط مشرق و مغرب کی طرف اپنا منہ کر لیا کرو بلکہ نیکی یہ ہے کہ لوگ اللہ اور قیامت کے آنے پر اسکے فرشتوں پر اور کتابِ الٰہی پر اور تمام پیغمبروں پر ایمان لائیں اور مال کی محبت کے باوجود یا دوسری تفسیر کی بنا پر اللہ کی محبت میں مال کو رشتہ داروں، یتیموں، محتاجوں، مسافروں اور سوال کرنے والوں کو دیں اور گردنوں کے چھڑانے میں خرچ کریں اور نماز پڑھیں اور زکوٰۃ ادا کریں اسی طرح جب وہ کوئی عہد کر لیں تو اسے پورا کریں نیز سختی اور تکلیف میں اور جنگ کے وقت ثابت قدم رہیں۔ یہی لوگ ایمان میں سچے ہیں اور یہی لوگ صاحبانِ تقویٰ ہیں۔

اس کے ساتھ ہی سورۂ بقرہ کی ابتدا میں نجات و فلاح صرف صفتِ تقویٰ سے وابستہ کی گئی ہے اور صاحبانِ تقویٰ کی صفتیں اس طرح بیان فرمائی گئی ہیں: ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِیْنَ الَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ وَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ" اس آیت کریمہ اور اس کے بعد کی چند آیات کا ترجمہ یہ ہے:- یہ کتاب یعنی قرآن حکیم بلاشبہ اللہ کا کلام ہے جو صاحبانِ تقویٰ کے لئے رہنما ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو غیب پر ایمان رکھتے ہیں اور نماز کو پابندی کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ اور جو کچھ ہم نے انہیں رزق عطا کیا ہے اس میں سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور یہ وہ ہیں جو ایمان رکھتے ہیں ان چیزوں پر جنہیں (اے رسولؐ) تم پر نازل کیا گیا ہے اور جو کچھ تم سے پہلے نازل کیا گیا تھا اُس پر بھی۔ اور یہ لوگ آخرت پر بھی پورا پورا یقین رکھتے ہیں۔ یہی لوگ اپنے پروردگار کی طرف سے ہدایت پر ہیں اور یہی لوگ فلاح یافتہ یعنی کامیاب ہیں۔ دنیا کی فلاح و نجات تو ان کو اس طرح حاصل ہوئی کہ انہیں ہدایت کا راستہ مل گیا اور گمراہی سے نجات پا گئے، کیونکہ انھیں انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ کے لئے ایک ایسا مکمل اور جامع ترین دستورِ حیات مل گیا جس سے بہتر کوئی دوسرا دستور ممکن نہیں ہو سکتا جس میں ہر قسم کی دنیوی فلاح مضمر ہے اور جو ہر طرح کی کامیابی اور نجات کی بھرپور ضمانت ہے اور آخرت کی فلاح یہ کہ وہاں دنیوی نیکیوں کا بہترین صلہ اور انعام دیا جائے گا۔ لفظ" فلاح " دنیا اور آخرت کی تمام

نیکیوں کے لئے بولا گیا ہے جبکہ نیکیوں اور خوبیوں کے لئے کلام عرب میں اس سے زیادہ جامع اور وسیع تر کوئی دوسرا لفظ موجود نہیں ہے۔ علامہ مرتضیٰ زَبِیدی نے تاجُ العروس شرح قاموس میں اس کی اس طرح تشریح کی ہے۔ لَیْسَ فِیْ کَلَامِ الْعَرَبِ کُلِّہٖ اَجْمَعُ مِنْ لَفْظَۃِ الْفَلَاحِ لِخَیْرِیِ الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ کَمَا قَالَ اَئِمَّۃُ اللِّسَانِ۔ یعنی کلام عرب میں دنیا اور آخرت کی نیکیوں کے لئے "فلاح" کے لفظ سے زیادہ جامع کوئی دوسرا لفظ موجود نہیں ہے جیسا کہ ائمہ لغت نے اس کی تصریح کر دی ہے۔

غرض دنیا کی اور آخرت کی تمام کامیابیاں اور نجات و فلاح صرف صاحبانِ تقویٰ کے لئے ہے اور یہ وہی لوگ ہیں جن کی صفتیں قرآن حکیم نے بیان کر دی ہیں۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے ذریعہ سے اعلان و ظہورِ اسلام سے قبل دنیا کے لوگ طرح طرح کی توہم پرستیوں میں مبتلا تھے اور کچھ مخصوص چیزوں ہی کو خیر اور نیکی کا مصداق سمجھ لیا گیا تھا۔ قرآن حکیم نے نیکی کے مفہومِ عام کو صاف لفظوں میں بتا دیا کہ نیکی صرف خاص خاص شکل و ترتیب کی عبادتوں یا مخصوص باتوں کا نام نہیں ہے بلکہ عقائد و اعمال کی اُن خوبیوں کا نام ہے جو

انسانی زندگی کے کسی رُخ اور کسی شعبہ ہی سے کیوں نہ متعلق رکھتی ہوں ظاہر بات ہے کہ نیکی اور بدی کا تصوّر تو اُس وقت تک ہو ہی نہیں سکتا جبتک اللہ پر ایمان کامل نہ ہو اور اس کی کتابوں اور پیغمبروںؑ کی سچائی کا یقین نہ ہو ان ہی کتابوں اور پیغمبروںؑ کے ذریعہ سے ہمیں کسی بات کے اچھے یا بُرے ہونے کا علم حاصل ہو سکتا ہے ورنہ اگر یہ ذریعہ نہ ہو تو پھر نیکی اور بدی، اچھائی اور برائی یا خیر و شر کا ایسا تعین ہم خود نہیں کر سکتے جو پورے یقین کے ساتھ اصل حقیقت کے مطابق ہو اور وہ ساری انسانیت کے لئے حرفِ آخر کی حیثیت رکھتا ہو کیونکہ ہمارا ذہن اور ہماری فکر اور رائے ہمیشہ ماحول کی تابع ہوا کرتی ہے اور اسی وجہ سے کسی ایک بات پر بھی آج تک دنیا کے تمام انسان متفق و متحد نہ ہو سکے اور نہ آئندہ ہو سکتے ہیں۔ اُن کے گرد و پیش کے حالات مختلف ہوتے ہیں، تاثرات مختلف ہوتے ہیں، فکر کے انداز اور نظر کے زاویے الگ الگ ہیں۔ ایک چیز کسی کے نزدیک اچھی ہے تو دوسرے کے نزدیک انتہائی بری اس بناء پر اچھے اور بُرے کی اس طرح تعیین کے لئے کہ اُس میں اختلاف رائے کی گنجائش ممکن نہ ہو سوائے اس کے کوئی دوسرا راستہ ممکن ہی نہیں ہو سکتا کہ وہ اللہ کی جانب سے ہو جس کا صاف مطلب یہی ہوا کہ نیکی اور برائی کا تعیّن احکامِ خداوندی ہی کی

روشنی میں ممکن ہو سکتا ہے اس کے علاوہ کسی اور صورت سے نہیں ہو سکتا۔ اس بنا پر نیکی اور بدی کو سمجھنے کے لئے حکم الٰہی کی طرف رجوع کرنا اور اس پر ایمان لانا ہر حال میں لازمی ہے بلکہ نیکی تو خود یہی بات ہے کہ انسان اللہ، اُسکے رسولوںؑ اور اس کی تمام کتابوں نیز اُن تمام باتوں پر ایمان و اعتقاد رکھے جو مرسلینؑ اور کتب الٰہیہ کے ذریعہ سے اُسے تعلیم دی گئی ہیں اور اس اعتقاد کے ساتھ اپنے عمل کو بھی اللہ کے حکم کے مطابق کر دے اور کوئی ایسی بات نہ کرے جس سے اُس کی نافرمانی ظاہر ہو رہی ہو۔ عملی رخ کا ذکر کیا گیا تو سب سے پہلے یہ بتایا گیا کہ نیکی یہ ہے کہ اپنے مال کو جو تمہارے نزدیک بیحد محبوب چیز ہے اللہ کے حُکم سے اور اُس کی محبت میں صرف کیا کرو اس کی راہ اور اس کی محبت میں مال و دولت کے صرف کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی حکمِ الٰہی کے سامنے اپنی خواہشات کو دبائے اور اپنے ذاتی شوق کو اس کے حکم اور اس کی مرضی پر قربان کر دے مختصر یہ کہ اُن تمام ذمہ داریوں کو جو اسلام کے معاشی نظام کے تحت اُس پر عائد ہوتی ہیں اور ساتھ ہی فکری اور جسمانی عبادتوں کو بھی انجام دے جن کا اس کی ذات سے تعلق ہے ساتھ ہی اُن ذمہ داریوں کو بھی پورا کرے جو اجتماعی طور پر اس سے متعلق ہوتی ہیں اور جو معاشرہ کے دوسرے

افراد سے متعلق ہیں۔ اس طرح نیکی کا قرآنی اور اسلامی مفہوم انسان کی زندگی کے ہر شعبہ سے وابستہ ہے اور کوئی رخ بھی ایسا نہیں ہے جو اس کی جامعیت سے خارج ہو۔ ظاہر ہے کہ نیکی اپنے اسی جامع مفہوم کے ساتھ بھی انسانی فلاح و نجات کا ذریعہ ہے اور اس کے مقابلہ میں بدی اور شر ہلاکت و بربادی اور نامرادی و گمراہی کی علامت ہے۔ سورۃ حٰمٓ السجدہ میں اللہ کا ارشاد ہے: وَلَا تَسْتَوِی الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ۔ نیکی اور بدی ہرگز ایک دوسرے کے برابر نہیں ہو سکتے کیونکہ نیکی نجات کا راستہ ہے اور بدی ہلاکت اور تباہی کی راہ ہے۔

مقامِ انسانیت

قرآن حکیم نے بتایا ہے کہ اللہ نے کائنات کے پورے معاشرہ میں انسانیت کو وہ مقام عطا کیا ہے جو کسی دوسری چیز کو نہیں ملا۔ انسانیت کا اصلی مقام ہی نہ سمجھنے سے دنیا ہمیشہ اپنے صحیح راستہ سے بھٹکتی رہی اور وہ ہر بڑی اور چھوٹی چیز کی پرستش کرتی رہی خواہ وہ ستارے ہوں، جانور ہوں یا پتھر اور مٹی کی بنی ہوئی مورتیاں۔ یہ جہالت اور بے خبری کی باتیں صرف اس وجہ سے تھیں کہ انسان اپنے مقام و منزلت کو نہیں پہچانتا تھا۔ قرآن پاک نے اسے روشنی عطا کی اور اسے بلندیوں سے روشناس کیا جو اس کی تقدیر کے اصلی خطوط ہیں۔

سورۂ بنی اسرائیل (اسراء آیت ۷۰) میں ارشاد خداوندی کا ترجمہ یہ ہے: اور ہم نے بنی آدمؑ کو عزت دی ہے اور ہم ہی نے انہیں بحر و بر میں حمل و نقل کے وسیلے عطا کئے اور ہم نے ان کو اپنی کثیر مخلوق پر بڑی فضیلت دی ہے۔

سورۂ المؤمنون (آیت (۱۲) اور اس کے آگے) میں انسان کی پیدائش کا بڑے حسن کے ساتھ اور بڑے ہی دلکش انداز میں ذکر کیا گیا ہے۔ ترجمہ یہ ہے: بیشک ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا پھر ہم نے اس کو نطفہ بنایا پھر اسے جمے ہوئے خون کا ٹکڑا بنا دیا۔ پھر اسے گوشت کے لوتھڑے کی شکل دیدی۔ اس کے بعد اس میں ہڈیاں پیدا کر دیں پھر ہم نے ہڈیوں پر گوشت چڑھا دیا پھر ہم نے اُسے ایک دوسری ہی مخلوق بنا دیا۔ کیسی شان والا ہے اللہ جو تمام صنّاعوں سے بہتر خلق کرنے والا ہے۔

سورۂ التّین میں اللہ کا ارشاد ہے: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ "یقیناً ہم نے انسان کو بہترین انداز پر پیدا کیا ہے" (آیہ/۴)

(آیہ/۲۰) سورۂ لقمان میں اس طرح انسانیت کی منزل بتائی گئی ہے اور یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ اسے کائنات کے پورے معاشرہ میں کیا حیثیت حاصل ہے۔ اَلَمْ تَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاَسْبَغَ عَلَیْكُمْ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً ط کیا تم نے اس بات پر غور نہیں کیا کہ جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے یقیناً اللہ نے اُس سب کو

تمہارا تابع بنادیا ہے اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کردی ہیں۔ اس طرح قرآن حکیم نے اس حقیقت کی صاف طریقے پر پوری پوری وضاحت کردی ہے کہ اللہ نے اس کو وہ مقام عطا کیا ہے جس کے سامنے آسمان اور زمین کی ہر مخلوق صرف ایک اطاعت شعار اور فرماں بردار کی حیثیت رکھتی ہے۔ اسی بات کو دوسرے لفظوں میں (سورۂ جاثیہ ۱۳/۴۵ میں) اس طرح فرمایا گیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے: اور اللہ نے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے وہ سب کا سب اپنی جانب سے تمہارا مطیع و فرماں بردار بنادیا ہے۔ بیشک اس چیز میں ایسے لوگوں کے لئے نشانیاں موجود ہیں جو غور و فکر کرتے رہتے ہیں۔ شاعر مشرق اقبالؒ نے اپنے ایک شعر میں اسی قرآنی اعلان کی ترجمانی ان لفظوں میں کی ہے:

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے
جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

وہ انسان جو کیڑوں اور پتھروں اور چوپایوں کے سامنے سجدے کیا کرتا تھا اُسے یہ بات اسلام کے سوا کسی نے نہیں بتائی کہ وہ ان کا پجاری نہیں بلکہ حاکم اور آقا ہے اور یہ سب اس کے محکوم اور تابعِ فرمان ہیں۔ یہ افضلِ کائنات ہے،

اشرف خلق ہے اور اللہ نے اسے اپنی پوری مخلوق پر سرداری عطا کی ہے، اسلام ہی نے اُسے غفلت کے گہرے غار اور تہہ بہ تہہ اندھیروں سے نکالا اور روشنی و ہدایت کی نعمت عطا فرمائی ۔ جب انسان اپنی منزل اور مقام ہی سے بے خبر تھا اور وہ احساسِ کمتری میں سسک رہا تھا تو اس میں یہ جرأت کس طرح پیدا ہوتی کہ وہ کائنات پر حکومت کرنے کا ارادہ کرتا، وہ خلا کی تسخیر کا تصور کرسکتا، وہ چاند اور دوسرے سیاروں تک پہنچنے کی سعی و کوشش کرتا، وہ پہاڑوں کی چٹانوں کو پھاڑ کر ان کے پوشیدہ راز معلوم کرنے کا خیال بھی کرسکتا، وہ زمین اور سمندروں کے جگر کو چیر کر اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو حاصل کرسکتا ۔ کائنات کی غلامی اُس کے تصور اور احساس پر چھائی ہوئی تھی اسلئے وہ اُن خزانوں سے کوئی فائدہ حاصل نہیں کرسکتا تھا جو آسمانوں کی بلندیوں، زمین کی پستیوں اور فضا کی وسعتوں میں اُس کی آمد اور اسکے اشاروں کے منتظر تھے، وہ اپنی لامحدود صلاحیتوں سے بالکل بے خبر تھا تو پھر وہ کس طرح اُن صلاحیتوں کو کام میں لاسکتا تھا اور سائنس کے میدان میں اپنا کردار ظاہر کرسکتا تھا۔ اس گہری غفلت کے پردہ کو پھاڑ دینے والی آواز اور اس

گہری نیند سے جگا دینے والی للکار اسلام اور قرآن حکیم ہی کی تھی جس نے اس کو بتا دیا کہ تو محکوم نہیں، غلام نہیں، بیچارہ نہیں تابعدار نہیں بلکہ عالم کی ہر مخلوق کا حاکم اور سردار ہے اور جو کچھ بھی ہے، زمین و آسمان کی پہنائیوں اور وسعتوں میں، وہ سب کا سب تیرے ہی لئے ہے اور تیرے زیر فرمان ہے۔ اسی اعلان نے انسان کو جرأت و ہمت بخشی ہے کہ وہ اپنی صلاحیتوں سے کام لے کر فکر و تحقیق کے میدان میں قدم رکھے۔

قرآن کریم میں جا بجا انسان کو زمین و آسمان کی چیزوں میں غور و فکر کرنے کی اسی وجہ سے دعوت دی گئی ہے کہ وہ سب چیزیں انسان ہی کے لئے بنی ہیں۔ سورۂ ابراہیم میں آیتوں کا ایک سلسلہ ہے جس کا ترجمہ یہ ہے: اللہ ہی کی ذات ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور آسمانوں سے پانی کو نازل کیا پھر اُس پانی سے تمہارے لئے طرح طرح کے پھل بطور رزق کے پیدا کئے اور اُسی نے دریاؤں میں تیرنے والی کشتیوں کو تمہارا تابع کر دیا اور خود دریاؤں کو بھی تمہارے لئے مسخر بنا دیا وہی اللہ ہے جس نے سورج اور چاند کو تمہارا تابع بنایا اور تمہارے نفع کیلئے رات کو بھی اور دن کو بھی تمہارے لئے مسخر کیا۔

اور اُسی نے تمہیں ہر وہ چیز عطا کردی جس کی تمہیں ضرورت تھی پھر اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو گے تو کبھی ہرگز اُن کا شمار نہیں کر سکتے (آیہ ۱۴/۳۲-۳۴)

قرآن حکیم نے بار بار انسانی شعور کو جھنجھوڑا ہے تاکہ وہ کسی وقت بھی اس حقیقت کو بھولنے نہ پائے کہ وہ کائنات کا غلام نہیں بلکہ آقا اور رعیت نہیں بلکہ سردار ہے۔

(آیہ ۱۶/۵-۱۶) سورۂ نحل کی چند آیتوں میں کس قدر خوبصورتی سے **انسانیت** کے مرتبہ اور مقام سے دنیا کو آگاہ فرمایا گیا ہے جنکا مفہوم یہ ہے: اُسی اللہ نے چوپایوں کو پیدا کیا ہے جنکے روؤں وغیرہ سے تمہیں گرم لباس حاصل ہوتا ہے اور دوسرے فائدے بھی اُن سے حاصل کرتے ہو اور ان میں سے بعض کو تم اپنی غذا بھی بناتے ہو اور ان میں صبح و شام تمہاری رونق اور شان بھی ہے، وہ تمہارے سامان بھی اُٹھاتے ہیں اور ایک شہر سے دوسرے شہر اور جگہ جگہ لیجاتے ہیں۔ اُسی اللہ نے گھوڑے، خچر وغیرہ جیسے جانور بھی خلق کئے ہیں جو تمہارے کام آتے ہیں۔ اُسی اللہ نے تمہارے لئے آسمان کی بلندی سے پانی کو اتارا جسے تم پینے کے کام میں لاتے ہو اور اُسی سے

سبزہ زار پیدا ہوتے ہیں جن میں تم اپنے مویشی چراتے ہو۔ اُسی سے تمہارے لئے کھیتیاں لہلہاتی ہیں اور زیتون، کھجور، انگور اور قسم قسم کے دوسرے میوے پیدا ہوا کرتے ہیں۔ یہ سب چیزیں غور و فکر کرنے والوں کے لئے قدرتِ خداوندی کی بڑی نشانیاں ھیں۔ اُسی اللہ نے تمہارے لئے چاند، سورج، دن، رات اور تمام ستاروں کو مسخّر بنادیا ہے۔ اس میں عقل رکھنے والوں کے لئے بڑی نشانیاں ہیں۔ اللہ نے ان چیزوں کو بھی تمہارا تابع بنایا جنہیں اُس نے تمہارے لئے زمین پر پھیلا دیا ہے۔ اُن چیزوں کے طرح طرح کے رنگ اور طرح طرح کی قسمیں ہیں۔ اس میں بھی نصیحت حاصل کرنے والوں کے لئے بڑی نشانیاں ھیں۔ پھر وہی اللہ ہے جس نے سمندروں کو مسخّر بنادیا تاکہ تم ان میں سے تازہ گوشت حاصل کرو اور اپنے پہننے کے لئے زیور کی چیزیں نکال سکو اور تم اس بات کو بھی دیکھتے ہو کہ کشتیاں کس طرح آسانی سے پانی کو چیرتی ہوئی، آگے بڑھتی ہوئی چلی جاتی ہیں۔ تاکہ تم اللہ کی نعمتوں کو تلاش کرو اور اس کا شکر ادا کرتے رہو اور تم نے یہ بھی دیکھا! کہ اللہ نے زمین پر پہاڑوں کو کس طرح قائم کردیا ہے وہ تم کو لیکر

ڈگمگانے نہ لگے"۔۔۔ غرض انسان فکر و نظر کی عظیم نعمت سے قطعی طور پر محروم تھا۔ نہ اس کو اپنی پیدائش کے راز معلوم تھے نہ اپنی صلاحیتوں کا علم تھا اور نہ اپنے سے باہر کی کائنات کا پتہ تھا۔

آج انسانی فکر کو جو بلندی حاصل ہے اور اس کے لئے جو ذہنی ارتقا اور بلندی ممکن ہو سکی ہے وہ سب اسلام اور قرآنِ حکیم کی بدولت ہے۔ اسی کے ساتھ یہ بات بھی طے شدہ ہے کہ انسان کو اپنا مقام اور اپنی منزلت صرف اُسی وقت مل سکتی ہے جب وہ اس کے حاصل کرنے کی کوشش کرے جس قدر اسے فکر و نظر کی بلندی حاصل ہوتی جائے گی اُسی قدر وہ اپنی اصلی منزل سے قریب تر ہوتا جائے گا۔ کائنات کی بھری محفل میں جو کچھ ہے انسان ہی کے لئے ہے لیکن سعی و کوشش کے بغیر کچھ نہیں مل سکتا۔ قرآن حکیم نے اسے بھی ان لفظوں کے ساتھ سمجھا دیا ہے: لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ "انسان کو وہی ملے گا جس کی وہ کوشش کرے گا۔" (النجم/۳۹)

"جو بڑھ کر خود اٹھا لے بزم میں ساغر اسی کا ہے"

ایک طرف اللہ ہی کے حکم سے اللہ کے فرشتے انسان کے سامنے اپنا سر خم کرتے ہیں۔ جہان کی ہر چیز اُس کی خدمت میں

لگی رہتی ہے تو دوسری طرف وہ بھی کسی کا محکوم ہے اور وہ ہے اس کے خالق اور رازق اللہ کی ذات جس کی رضامندی، اطاعت، فرماں برداری کی عزت حاصل کرنا انسانی زندگی کا حاصل ہے اور اس کی تمام سربلندیاں اپنے مالک حقیقی کی عبادت واطاعت اور بندگی ورضامندی ہی میں پوشیدہ ہیں۔

قرآن پاک میں اللہ کا فرمان ہے: (الحجرات/۱۳) جس کا ترجمہ یہ ہے:

بارگاہِ خداوندی میں اُسی شخص کی عزت سب سے زیادہ ہے جو اپنے پروردگار کی سب سے زیادہ اطاعت کرتا ہو اور جس کے دل میں سب سے زیادہ اللہ کا خوف ہو۔"

کسی خبر کو سنکر اس سے اثر لینے سے قبل اسکی جانچ کر لو

اسلام نے کسی خبر کے بیان کرنے اور اسکی تصدیق کرنے میں مسلمانوں کو بہت زیادہ احتیاط سے کام لینے کی تاکید کی ہے کیونکہ زیادہ تر جھگڑے فسادات اور بڑی بڑی تباہکاریوں کی ابتدا افواہوں اور جھوٹی خبروں ہی سے ہوا کرتی ہے۔ لوگ یا تو خود ہی جان بوجھ کر غلط باتیں مشہور کیا کرتے ہیں تا کہ اُن کی آڑ لیکر وہ اپنے مقاصد کو حاصل کر سکیں یا پھر وہ سُنی سنائی باتوں کو بغیر تحقیق کئے اور بغیر ان کی جانچ کئے ہوئے صحیح سمجھ لیتے ہیں اور دوسروں سے بھی انھیں اسی طرح بیان کرنے لگتے ہیں جیسے وہ بالکل درست اور یقینی ہوں جسکے نتیجہ میں یہ لوگ بھی افواہوں کے اصلی گڑھنے والوں کی طرح ان تمام برائیوں اور تباہیوں کے ذمہ دار ہو جاتے ہیں جو ان بے بنیاد خبروں کی وجہ سے ظہور میں آتی ہیں۔ قرآنِ کریم میں خدا کا ارشاد ہے: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَکُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْٓا اَنْ تُصِیْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰی مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِیْنَ (الحجرات/۶) اے اہل ایمان اگر تمہارے پاس کوئی فاسق شخص کوئی خبر لے کر آئے تو تم اس کی خوب تحقیق کر لیا کرو (ایسا نہ ہو) کہ تم کسی قوم کو (اپنی) نادانی کی وجہ سے ضرر پہنچا دو

پھر اپنے کیے پر پچھتاؤ۔ اس آیۂ کریمہ میں واضح طور پہ خدا نے تمام مسلمانوں کو اسکا حکم عطا کیا ہے کہ اگر خبر دینے والے کا کردار صحیح نہ ہو تو اسکی بیان کی ہوئی باتوں کو بغیر پوری تحقیق کئے ہرگز نہ مانا جائے کیونکہ اس طرح خبر کی تصدیق کر لینے اور اس پر عمل کر لینے یا اس کو دوسروں تک پھیلانے میں شدید خطرے پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی قرآن کریم نے افواہوں کی تخلیق کرنے والوں اور بے بنیاد خبروں کے گڑھنے والوں کی حیثیت بھی واضح فرما دی ہے اور اس طرح افواہ طرازی کے ان دونوں پہلوؤں پر اسلامی نقطۂ نظر پوری طرح ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ جو لوگ حق بات کو چھپا کر غلط باتوں کو شہرت دیتے ہیں اسلام کے نزدیک وہ سچے مسلمان نہیں ہیں بلکہ منافق ہیں چنانچہ خدا کا ارشاد ہے:۔ يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِمْ مَا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ ط وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُونَ۔ (آل عمران/۱۶۷)

یہ (منافق لوگ) اپنے منہ سے وہ باتیں کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہیں اور جن باتوں کو وہ چھپاتے ہیں اُنہیں خدا خوب جانتا ہے" مطلب یہ ہے کہ یہ صرف منافقوں کا مکر و فریب ہے کہ وہ سچی باتوں کو جانتے ہوئے اپنی زبان سے اُن کے خلاف بیان کرتے ہیں اور اصلیت کو پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں مگر

خدا ان کی اس حرکت سے غافل نہیں ہے اور وہ اُن کے دلوں کا حال بخوبی جانتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ اگر کوئی شخص سچا مسلمان ہے اور دل سے قرآن کریم اور دین اسلام پر ایمان و یقین رکھتا ہے تو وہ کبھی جان بوجھ کر جھوٹی بات زبان سے نہیں نکالیگا اور وہی کہے گا جس کی سچائی اور صحت پر اسے یقین ہوگا اسی طرح بغیر تحقیق کئے اور بغیر پوری طرح یقین حاصل کئے وہ افواہوں پر کان کبھی نہ دھریگا اور ان پر عمل کبھی نہ کرے گا۔ یہ دونوں ہی باتیں غلط خبریں پھیلانے کی بدترین عادت کے دو انتہائی خطرناک رخ ہیں اور قطعاً غیر اسلامی ہیں۔ یہی وہ حدیں اور کنارے ہیں جن سے اس عادت کے مجسمہ کی تخلیق ہوتی ہے اور آخر میں پھر یہ واحد برائی اور اکیلا جرم نہیں رہتی بلکہ برائیوں، بد اخلاقیوں، گناہوں اور ہر قسم کی تباہ کاریوں کا ایک بڑا مجموعہ بن جاتی ہے اور ایک ایسا ناسور ہو جاتی ہے جو ہمیشہ رستا رہتا ہے اور جس سے انسانی معاشرہ کے ہر شعبہ کے لئے تباہی اور بربادی کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ ابتدا میں جو بہت معمولی شعلہ اور ننھی سی چنگاری معلوم ہوتی ہے وہ کچھ ہی عرصہ میں پوری انسانی زندگی کو جہنم بنا دیتی ہے اور پھر اس کی آگ پر قابو

پالینا کسی کے بھی بس میں نہیں رہتا یہاں تک کہ دوسروں کے ساتھ وہ لوگ بھی جو افواہ پھیلانے کے ذمہ دار ہوتے ہیں اس آگ کا ایندھن بننے سے بچ نہیں سکتے۔ غرض انسانی معاشرہ کی سلامتی اور امن و سکون بڑی حد تک اس بات پر منحصر ہے کہ اطلاعات فراہم کرنے اور خبر یا کوئی اور بات بیان کرنے یا اُس پر عمل کرنے میں پوری تحقیق کیجائے اور اُس کا پوری طرح جائزہ لیا جائے جب پورا یقین اور کامل اعتماد پیدا ہو جائے تو اُس وقت اس کی تصدیق کی جائے۔

کسی قوم کی تنظیم اور اتحاد کو فنا کرنے اور جماعتی وحدت کو ٹکڑے ٹکرے کرنے میں غلط خبریں پھیلانے کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ اور جو کام اسلحہ نہیں کر سکتا وہ اس کے ذریعہ سے لیا جاتا ہے۔ اور اسی بنا پر یہ بات بھی یقینی ہے کہ جو قوم افواہوں اور بے بنیاد خبروں کو نہیں روک سکتی وہ کبھی اپنے اندر تنظیم نہیں پیدا کر سکتی اور ہمیشہ افراتفری اور انتشار کا شکار بنی رہتی ہے۔ وہ اپنے معمولی سے معمولی اور حقیر دشمن کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتی اور نہ کسی میدان میں کبھی ترقی کر سکتی ہے۔ افواہ طرازی امن وامان کی دشمن ہے۔ نظم و ضبط کی ضد ہے اور بدامنی و انتشار کی ضمانت ہے

اس لیئے جب تک قوم کی صفوں سے اس مرض کو دور نہ کیا جائیگا اُس کے لیئے یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ زندگی کی دوڑ میں ایک قدم بھی آگے بڑھ سکے بلکہ اپنے وجود ہی کو باقی رکھ سکے - قرآن کریم نے سچی بات کہنے کی اسی وجہ سے مسلمانوں کو ہدایت اور تاکید کی ہے تاکہ وہ ان خرابیوں سے محفوظ رہ سکیں - ایک جگہ فرمایا گیا ہے : یَآ اَیُّھَا الَّذِیْنَ آمَنُوا اتَّقُوا اللّٰہَ وَقُوْلُوْا قَوْلاً سَدِیْدًا (احزاب ۰۰)

اے ایمان والو! خدا سے خوف کرو اور درست بات کہا کرو۔"

اس کا مطلب یہ ہوا کہ سچی اور درست بات کہنا خدا سے ڈرنے کی علامت ہے اور افواہ طرازی اس کا عکس ہے یعنی ایسے لوگ جو اس بری عادت سے پرہیز نہیں کرتے ان کے دل میں خدا کا بالکل خوف موجود نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے آدمیوں کا اسلام سے کس حد تک واسطہ اور علاقہ ہو سکتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی جھوٹی خبریں پھیلانا انسانی معاشرہ پر ایک بڑا ظلم بھی ہے اس لیئے کہ انسان کو اس کا بنیادی حق حاصل ہے کہ اسے ہمیشہ صحیح اور سچی بات بتائی جائے اور اگر ایسا نہ ہوگا تو وہ اپنے اس بنیادی حق سے محروم ہو جائے گا جسے دوسرے الفاظ میں ظلم کہا جاتا ہے اور یہ حقیقت طے شدہ ہے کہ اسلام اور ظلم ایک جگہ جمع

نہیں ہو سکتے۔

غلط گوئی یقیناً بدی اور برائی کی اشاعت ہے، اور قرآن کریم کا اعلان ہے کہ جو لوگ برائی پھیلاتے ہیں ان کے لیئے دنیا اور آخرت میں دردناک عذاب ہے۔ افواہ پھیلانا کذب صریح ہے، افترا پردازی ہے۔ خیانت اور فریب دہی ہے اور یہ سب وہ باتیں ہیں جن پر قرآن و حدیث میں لعنت اور مذمت کی گئی ہے سرورِ دو عالم نے فرمایا ہے: مَنْ غَشَّنَا فَلَیْسَ مِنَّا (صحیح مسلم) جو آدمی ہمیں دھوکا دیتا ہے اس سے ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ اسلام کا پیغام باہمی یگانگت و اخوت ہے، آپس کی محبت اور الفت ہے، اجتماعیت، وحدت اور مرکزیت ہے، اور اسکے برخلاف غلط گوئی سے اسلامی صفوں میں ابتری، انتشار اور افرا تفری کی تخلیق ہوتی ہے اس لیئے یہ بلاشبہ اسلامی نظریۂ زندگی سے شدید عملی بغاوت، الٰہی پیغام سے سرکشی، اور اسکی توہین ہے اور جو لوگ بھی اسلامی اخوت کا اس طرح مذاق اڑاتے ہیں اور جھوٹی خبریں پھیلا کر ملّتِ اسلامیہ میں افتراق، بدنظمی اور بدامنی پیدا کرتے ہیں ان کے دل و دماغ اسلامی روح اور ایمانی شعور سے قطعاً محروم ہیں۔

رواداری

اخلاقیات کا کوئی ایسا پہلو ممکن نہیں ہے جس کی اسلام نے تعلیم نہ دی ہو خواہ اس کا تعلق خود فرد سے ہو یا پورے معاشرہ سے ہو۔ رواداری بھی انسان کی اجتماعی زندگی کا اہم ترین اخلاقی پہلو ہے جسے اسلام نے اس قدر اہمیت دی ہے جسکی مثال کسی دوسری جگہ نہیں ملتی۔ قرآن پاک کے ارشادات، سرورؐ کائنات کی سیرتِ طیبہ اور اہلبیتِؑ اطہار اور اصحابؓ کرام کی مثالی زندگیاں رواداری کی تعلیم سے بھری ہوئی ہیں۔ سب سے بیشتر ہم قرآن حکیم پر نظر ڈالیں کہ اس میں اسکے متعلق کیا کیا ہدایتیں فرمائی گئی ہیں ــــ تو سورہٗ بقرہ/ ۸۳ میں اللہ کا ارشاد ہے: وَقُوْلُوْا لِلنَّاسِ حُسْنًا۔ یعنی لوگوں سے بھلے انداز میں بات کیا کرو۔ اس حکم میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی شرط یا قید نہیں ہے۔ تعلیم اس بات کی دی جارہی ہے کہ جس سے بھی گفتگو کرو انتہائی خوبصورت اور اچھے

اور بھلے طریقے پر تاکہ تمہاری باتوں سے سننے والے کو تکلیف نہ پہنچے اور تمہاری گفتگو سے وہ برا اثر نہ لے اور ظاہر ہے کہ یہ چیز اُسی وقت ممکن ہوسکتی ہے جب انسان کی طبعیت میں رواداری کا جذبہ موجود ہو اور اُس میں اس قدر برداشت کی طاقت ہو کہ وہ دوسروں کے ساتھ اپنی گفتگو اور اپنے ہر قسم کے برتاؤ کو روادارانہ بنا سکے۔

اس طرح قرآن مجید نے اپنے اس فرمان سے نوع انسان کو اُس کے ایک عام انسانی فرض کی طرف متوجہ کیا ہے اور خاص طور پر مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ وہ بلا امتیاز ہر انسان سے خوش خلقی کے ساتھ پیش آتے رہیں۔ جب تک وہ عقلی اور اور شرعی طور پر اس کے خلاف عمل کرنے پر مجبور نہ کر دیئے جائیں۔

سورۂ مائدہ ۶ میں اس طرح فرمایا گیا ہے۔ ترجمہ یہ ہے:
اور کسی گروہ کی دشمنی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ تم اس کے ساتھ انصاف ہی نہ کرو۔ تم ہمیشہ انصاف کرتے رہو کیونکہ یہ پرہیزگاری سے بہت قریب ہے" اس کا حاصل یہ ہوا کہ کوئی شخص کسی کا بدترین دشمن ہی کیوں نہ ہو مگر اسلام کی تعلیم یہی ہے

کہ اس دشمن کے ساتھ بھی منصفانہ برتاؤ کیا جائے اور یہ اُسی وقت ہو سکتا ہے جب انسان کو اپنے نفس پر اس قدر قابو ہو کہ وہ کسی قسم کے جذبہ سے خواہ وہ ذاتی ہو یا اجتماعی متأثر نہ ہو سکے بلکہ ہر معاملہ میں وہ دوسروں کے ساتھ بڑے دماغی سکون، وسعتِ نظر، بڑے اطمینانِ قلب، انتہائی برداشت اور خوش خُلقی کے ساتھ پیش آتا رہے۔ سورۂ نحل میں تو اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ اس طرح ارشاد ہوا ہے: اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ ط اے رسول تم اپنے پروردگار کی راہ کی طرف لوگوں کو حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ سے دعوت دو اور ان سے بحث بھی کرو تو ایسے طریقہ سے جو اچھا ہو۔ تقریباً اسی مفہوم کو سورۂ حٰم السجدہ ر۲ میں ان لفظوں کے ساتھ بیان کیا گیا ہے: وَلَا تَسْتَوِى الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ؕ اِدْفَعْ بِالَّتِىْ هِىَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِىْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِىٌّ حَمِيْمٌ ۔ نیکی اور بدی برابر نہیں ہے تم نیکی سے (بدی) کو دفع کر دیا کرو تو پھر اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جس شخص کے اور

تمہارے درمیان دشمنی ہے وہ ایسا ہو جائے گا جیسے کوئی مخلص دوست ہوا کرتا ہے۔

(آیہ ۱۷-۱۸) سورۂ لقمان میں حضرت لقمانؑ اور اُن کے فرزند کے واقعات بیان کر کے نسل انسانی کو رواداری کی یوں تعلیم دی جاتی ہے: وَاصْبِرْ عَلٰى مَآ اَصَابَكَ ۖ اِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۚ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِى الْاَرْضِ مَرَحًا۔" جو کچھ تمہیں پیش آئے اُس پر ضبط و صبر سے کام لو۔ بے شک یہ بڑی ہمت کا کام ہے اور لوگوں کی طرف سے اپنا منہ نہ پھیرو یعنی اُن کے ساتھ بے رخی کا برتاؤ نہ کیا کرو اور زمین پر اکڑ کے نہ چلو"۔ کتاب اللہ نے کس قدر خوبصورتی کے ساتھ ہمیں انسانیت کا یہ بنیادی سبق دیا ہے کہ ہم اپنے تمام معاملات اور تمام مسائل میں جذبۂ رواداری کو پیش نظر رکھیں۔ اس کی وجہ سے ہمیں بہترین اجتماعی فائدوں کے علاوہ انفرادی فائدے بھی حاصل ہوں گے اور بے رخی علاقائی، ملکی، لسانی، نسلی یا جماعتی تعصب اور غیر روادارانہ حرکات سے جو بُرے نتائج پیدا ہوتے ہیں ان سے ہم انفرادی اور

اجتماعی دونوں حیثیتوں سے بالکل محفوظ رہیں گے اس سلسلہ میں ایک صاف سی بات یہ ہے کہ جب ہم دوسروں کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کریں گے تو دوسرے بھی ہمارے ساتھ نرمی اور خوش اخلاقی اور رواداری سے پیش آئیں گے اگر اُن میں ذرا سی بھی شرافت اور انسانیت موجود ہے لیکن اس کے برخلاف اگر ہم دوسروں کے ساتھ عصبیّت اور بداخلاقی سے پیش آئیں گے اور اُن کی بات کو برداشت نہ کریں گے تو پھر وہ بھی ہمارے ساتھ اسی قسم کا برتاؤ کریں گے اور یہ درحقیقت خود ہمارے ہی عمل کا ردِّ عمل ہوگا اسی لئے قرآن پاک میں صاف لفظوں میں مسلمانوں کو اس سے منع کیا گیا ہے کہ وہ غیر مسلموں کے معبودوں پر سبّ وشتم نہ کریں چنانچہ سورۂ انعام/ ۱۰۸ میں اللہ نے فرمایا ہے: وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا بِغَيْرِ عِلْمٍ ؕ اور تم انہیں دشنام نہ دو جن کو یہ لوگ اللہ کے سوا پکارتے رہتے

ہیں یعنی اُن کے معبودوں پر سب و شتم نہ کرو ورنہ وہ لوگ بھی انتقام اور دشمنی کی بنا، پر اپنی حد سے گذر کر اپنی جہالت کی وجہ سے اللہ کی شان میں بے ادبی اور گستاخی کریں گے۔ مقصود یہ ہوا کہ اگر تم رواداری سے کام نہ لو گے تو تمہارے سخت اور متعصّبانہ برتاؤ کے نتیجے میں تمہارے دشمن بھی اللہ کی شان میں گستاخی کریں گے اور اس کا سبب صرف تمہارا اپنا عمل ہی ہوگا اسلئے ضروری ہے کہ ہم رواداری کی اس تعلیم پر شدّت سے عمل کریں تاکہ اس کے ذریعہ سے ہم قومی اور انفرادی سطح پر ایک انتہائی مفید اور تعمیری زندگی کے فائدے حاصل کرنے کے قابل بن سکیں۔

سورۂ آل عمران کی ایک اور آیت (۱۵۹) میں بھی اس حقیقت سے آگاہ فرمایا گیا ہے کہ رواداری اور نرم برتاؤ اجتماعی زندگی کے نظام کو برقرار رکھنے، ترقی دینے اور اسے زیادہ سے زیادہ مفید اور کارآمد بنانے میں کس درجہ ضروری ہے جبکہ بداخلاقی اور عصبیت

اور دل آزاری نہ صرف انفرادی نظام زندگی کو درہم برہم کر دیتی ہے بلکہ پورے معاشرہ کو بھی بد نظمی اور انتشار کی آگ کے شعلوں کی لپیٹ میں لا سکتی ہے اور اس طرح اسے ہمیشہ کے لئے تباہی کے گہرے غار میں جھونک سکتی ہے اور بربادی کی اُس منزل تک پہنچا سکتی ہے جہاں تک پہنچ کر اس کا نام و نشان تک باقی نہ رہے۔ ارشاد ہوتا ہے: فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ "۔ یہ اللہ کی رحمت ہی کے سبب سے ہے کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نرم رہے اور اگر تم درشت طبع اور سخت دل ہوتے تو یہ سب لوگ تمہارے پاس سے منتشر ہو جاتے"۔ یہ اور اس قسم کی تمام آیات قرآنی اسلام کے مسلک کی پورے طور پر وضاحت کر رہی ہیں کہ اُس کے نزدیک رواداری انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لئے کس قدر اہمیت کی حامل ہے اب آیئے ایک نظر احادیث پر بھی ڈالی جائے تو ہمیں اس سلسلہ میں بے شمار حدیثیں ملتی ہیں جن میں اسی کی تعلیم دی گئی ہے کہ ہم نہ صرف اپنے ہم مسلک، ہم قوم،

ہم وطن لوگوں کے ساتھ روادارانہ برتاؤ کریں بلکہ ہر انسانی فرد سے کریں خواہ وہ کوئی بھی ہو۔ سرورکائنات ؐ کا ارشاد ہے: کُونُوْا عِبَادَ اللّٰہِ اِخْوَانًا" اے اللہ کے بندو! تم آپس میں بھائیوں کی طرح رہو۔ دوسری حدیث میں ہے: اُحِبَّ لِلنَّاسِ مَا تُحِبُّ لِنَفْسِكَ" جو اچھی بات تم اپنے لئے پسند کرتے ہو وہی بات دوسروں کے لئے بھی پسند کرو۔ مطلب یہ ہوا کہ تم اپنے لئے کسی حال میں بھی یہ بات پسند نہ کروگے کہ کوئی شخص تمہاری دل آزاری کرے بس اسی طرح تم بھی کسی دوسرے کی دل آزاری نہ کرو اور ہر ایک سے رواداری کا برتاؤ کرو۔ ایک اور حدیث میں یوں ہے: خَیْرُ النَّاسِ اَنْفَعُھُمْ لِلنَّاسِ" بہترین انسان وہ ہے جو دوسرے انسانوں کو سب سے زیادہ فائدہ پہنچائے۔ اس سلسلہ میں حضور ؐ انور کا یہ ارشاد بھی ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے: اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ النَّاسُ مِنْ لِسَانِہٖ وَیَدِہٖ" سچا مسلمان وہی ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے انسانی افراد محفوظ رہیں۔ رواداری کی تعلیم حضور ؐ انور نے

قول سے بھی دی ہے اور اپنی سیرت سے بھی۔ سیرت کی کتابوں میں اس سلسلہ کے واقعات کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ ان ہی میں صُلح حُدَیبیَہ کا مشہور واقعہ بھی ہے جہاں آپ نے اپنے مخالف سُہَیل بن عمرو کی بہت سی باتوں کو محض رواداری جذبہ کی بناء پر تسلیم کر لیا تھا یہ جانتے ہوئے کہ اس رواداری سے وہ فائدہ حاصل ہوگا جو دل آزاری سے کبھی ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا۔ غرض اسلام تعصب، فرقہ واریت اور دل آزاری کا سخت ترین مخالف ہے اور اس بات کو سمجھنے کے لئے حدیث کے یہ لفظ بالکل کافی ہیں۔ مَنْ تَعَصَّبَ فَقَدْ خَلَعَ رِبقَۃَ الْاِیْمَانِ مِنْ عُنُقِہٖ" یعنی جو شخص عصبیت سے کام لے۔ اس نے اپنے عمل سے گویا ایمان کے طوق کو اپنے گلے سے نکال کر پھینک دیا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود یہ بھی بہرحال ایک حقیقت ہے کہ ہر چیز کی ایک حد اور انتہا ہوا کرتی ہے اور اس سے تجاوز کرنے کی کسی کو بھی اجازت نہیں دی جا سکتی اس بنا پر یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ رواداری صرف اُسی حد تک قابل تعریف

اور ممدوح ہے جبتک فرد کی زندگی، اس کی شخصیت اور اس کا مقصدِ حیات متأثر نہ ہو رہا ہو یا ملک اور معاشرہ کی عزت و بلندی، اُسکا تشخص، اسکی ساکھ اور اُس کے نظریہ کو دھکا نہ لگ رہا ہو کیونکہ ایسی صورت حال میں رواداری کا مفہوم خودکشی کے برابر ہوگا اور اُس کی تعمیری حیثیت تخریبی رخ میں تبدیل ہو جائے گی جو عقلی اور شرعی کسی بھی معیار پر درست نہیں ہے۔

خود سپردگی

ایمان اور اسلام دراصل خود سپردگی ہی کے دوسرے نام ہیں ایک سچے مسلمان اور حقیقی مؤمن کی یہی شان ہوتی ہے کہ وہ اپنی ہر چیز یہاں تک کہ اپنی جان بھی اللہ ہی کے سپرد کر دے یعنی وہی کرے اور وہی چاہے جو اللہ کی مرضی ہو۔ اسی خود سپردگی کا دوسرا نام "تفویض" ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اپنی جان و مال اور اپنا سب کچھ اللہ کے حوالے کر دے اور ہر کام میں اُسی کی رضا کا طلبگار رہے۔ اسی خود سپردگی اور تفویض کی طرف "اُفَوِّضُ اَمْرِیْٓ اِلَی اللّٰہِ" (المؤمن ۴۴) سے اشارہ کیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں اسکے علاوہ دیگر مقامات پر بھی اسکی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ (سورہ بقرہ ۲۰۷) میں ارشاد ہوا ہے: وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّشْرِیْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ" لوگوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو اپنی جان تک اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے بیچ ڈالتے ہیں اور اللہ بندوں کے حق میں بڑا شفیق ہے" اس کے بعد فرمایا گیا ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً ۪ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطٰنِ" اے ایمان والو تم اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو"۔ یہاں رضائے الٰہی کے عوض نفس کو بیچ ڈالنا یا اسلام میں پوری طرح داخل ہونا"۔ ان جملوں سے مراد یہی ہے کہ بندہ اپنی زندگی اور اپنی ہر چیز کو اللہ کے حوالے کر دے اور اس کے تمام اعمال و افعال رضائے خداوندی کے تابع ہوں۔

اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ اسلام صرف چند عقیدوں یا عبادتوں کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک مکمل نظامِ حیات اور دستورِ زندگی ہے جو انسان کی زندگی کے ہر رخ اور ہر شعبہ کو گھیرے ہوئے ہے۔ خواہ زندگی کا وہ رخ بندوں کے حقوق سے متعلق ہو یا اللہ کے حقوق سے۔ انفرادی زندگی سے تعلق رکھتا ہو یا اجتماعی زندگی سے۔ اس لئے سچے مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ افکار اور نظریات و اعتقادات سے لیکر عمرانیات، اخلاقیات اور معاشیات و عبادات سبھی میں الٰہی نظام کا تابع ہو۔ یہی ہے وہ سپردگی جو اسلام و ایمان کا بنیادی تقاضا ہے۔ اور اس تقاضے کا صحیح مفہوم یہ ہوگا کہ اسلام اس خود سپردگی کی وسعت میں کسی دوسرے دین

یا کسی دوسرے نظام کی پیوند کاری برداشت نہیں کر سکتا۔
اسی جامع نظریہ کی طرف سورۂ انعام کی آیت ۱۶۲ میں اس طرح
اشارہ کیا گیا ہے: قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ
لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ " اے رسول کہہ دو کہ میری نماز اور میری
ساری عبادتیں اور میری زندگی اور میری موت صرف اللہ کے لئے
ہے جو سب جہانوں کا پروردگار ہے' اس بات کا یہ کھلا ہوا اعلان
ہے کہ اسلام و ایمان نام ہی ہے تسلیم و رضا اور بندگی و اطاعتِ
الٰہی کا' اور فکر و عمل کی اس خود سپردگی کا جو حصول رضائے الٰہی
کی سب سے بڑی بنیاد ہے۔ اسی سپردگی کی طرف سورۂ توبہ ۱۱۱
میں اس طرح متوجہ کیا گیا ہے: اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ
اَنْفُسَھُمْ وَ اَمْوَالَھُمْ بِاَنَّ لَھُمُ الْجَنَّۃَ ؕ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ
سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ وَعْدًا عَلَیْہِ حَقًّا فِی
التَّوْرٰىۃِ وَالْاِنْجِیْلِ وَالْقُرْاٰنِ ؕ وَمَنْ اَوْفٰی بِعَھْدِہٖ مِنَ
اللّٰہِ فَاسْتَبْشِرُوْا بِبَیْعِکُمُ الَّذِیْ بَایَعْتُمْ بِہٖ ؕ وَذٰلِکَ
ھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ " بیشک اللہ نے سچے اہل ایمان سے
ان کی جانوں اور اموال کو اس کے عوض میں خرید لیا ہے کہ
انہیں جنت دی جائے گی۔ یہ لوگ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں

تو کبھی (اپنے دشمنوں کو) قتل کرتے ہیں اور کبھی خود ہی قتل کر دیئے جاتے ہیں۔ یہ وعدۂ الٰہی ہے جو حق ہے اور توراۃ و انجیل اور قرآن میں لکھا ہوا ہے اور اللہ سے بڑھ کر کون اپنے وعدے کو پورا کرنے والا ہے تو تم اپنی اس بیع پر خوشی مناؤ جس کا تم نے سودا کیا ہے اور یہی بڑی کامیابی ہے"

اس آیت میں نفس کی جس خرید و فروخت کا ذکر ہے وہ کھلی ہوئی خود سپردگی ہے کیونکہ جب کوئی چیز بیچ ڈالی جاتی ہے تو پھر وہ بیچنے والے کی نہیں رہا کرتی بلکہ وہ خریدنے والے کی ہو جاتی ہے۔ پھر اُس پر بیچنے والے کو خریدار کی اجازت کے بغیر کسی تصرّف کا اختیار باقی نہیں رہتا۔

یہاں اس بات کا بھی اعلان ہے کہ اپنے نفس کو اللہ کے سپرد کرنے اور اس کے ہاتھ بیچ ڈالنے والا چاہے شہید ہو جائے یا زندہ رہے، اگر وہ اس سپردگی پر قائم ہے تو اس کے حق میں یہ وعدۂ الٰہی ضرور پورا ہوگا اور رضائے خداوندی جس کا سب سے بڑا مظہر جنّت ہے' وہ اس کا مستحق قرار دیا جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی اسے بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ اس خرید و فروخت کے معاملے میں بیچنے والے کی جانب سے قیمت یا کسی اور چیز کی کوئی شرط و قید نہیں ہے بلکہ وہ تو

اللہ کی بارگاہ میں جان و مال کا نذرانہ بغیر کسی شرط کے پیش کر رہا ہے ۔ اور اس کے عوض میں اللہ اپنی عنایت و کرم سے جنت کا وعدہ کرتا ہے اور ظاہر بات ہے کہ بیچنے والا بندہ اپنے آقا اور مالک سے کوئی شرط لگا بھی کب سکتا ہے اس لئے کہ اس کے پاس جو کچھ بھی ہے وہ تو اصل میں اللہ ہی کا ہے ۔ مال بھی اُسی کا ہے اور جان بھی اُسی کی ۔ پھر اپنی ہی مِلک کو قیمت ادا کر کے اور خرید کر واپس لینا کرم بالائے کرم نہیں تو اور کیا ہے ۔

سیرت کی کتابوں میں لکھا ہے کہ ۱۳ھ (بعثت) میں مدینہ کے ستّر ذمہ دار افراد نے مکّہ میں آکر سرورؐ کائنات سے بیعت کی تھی ۔ یہ عَقَبہٴ ثانیہ کی بیعت تھی ۔ ان لوگوں کی قیادت عبدؓ اللہ بن رَواحہ انصاری خَزرَجی کر رہے تھے ۔ انہوں نے حضورؐ سے عرض کی کہ آپ اپنی اور ربّ کی طرف سے اس معاملۂ بیع کی شرطیں بیان کیجئے تو آپ نے فرمایا کہ میرے ربّ کی شرط تو یہ ہے کہ تم اُسی کی عبادت کرو اور کسی دوسرے کو اُس کا شریک نہ بناؤ اور میری شرط یہ ہے کہ جس طرح تم اپنی حفاظت کرتے ہو میری بھی حفاظت کرو "۔ غرض بندوں کی جانوں اور مال و دولت کا اصلی مالک اللہ اپنی عطا کی ہوئی چیزوں کو اُن بندوں سے فقط اتنی سی بات پر خریدنے کا وعدہ کرتا ہے کہ

صرف وہ اس کی اطاعت کریں اور اس پیغام کی حفاظت کا فرض انجام دیں جو اُس کے رسولؐ نے پہنچایا ہے۔

اس بیع و شرا کا سب سے بڑا منظاہرہ مردِ مومن کی شہادت ہے جب وہ اللہ کی راہ میں اپنی زندگی کا نذرانہ پیش کرتا ہے اور تسلیم و رضا کے عظیم مقصد کو حاصل کرنے کے لئے اپنے خون کو بیدریغ بہادیتا ہے، قرآن حکیم نے ایسے ہی لوگوں کے لئے سورۂ نور میں اعلان کیا ہے (نور ۲۴/ ۳۷) کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں یادِ الٰہی سے نہ تو تجارت غفلت میں ڈالتی ہے اور نہ بیع و شرا اور نہ وہ نماز و زکوٰۃ سے کبھی غفلت کرتے ہیں، وہ اُس قیامت کے دن سے ڈرتے ہیں جب آنکھیں اور دل اُلٹ جائیں گے" اور ایسے ہی مردانِ حق کیلئے سورۂ دہر میں یہ فرمایا گیا ہے ("الدھر" ۳۰) وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ" تم تو وہی چاہتے ہو جو اللہ چاہتا ہے" یہ لوگ جب اپنی جان و مال سبیلِ خدا میں لٹا کر عالمِ قدس کی طرف رخ کرتے ہیں تو اُن سے یہ خطابِ الٰہی ہوتا ہے" اے نفسِ مطمئنہ! اپنے پروردگار کی طرف پلٹ آ۔ تو اُس سے خوش اور وہ تجھ سے راضی۔ میرے خاص بندوں میں شامل ہو جا! اور میری جنت میں آجا۔ (سورۃ الفجر ۸۹/ ۲۷،

حضرت سید الشہداء امام حسین علیہ السّلام سپردگی کی اِسی منزل پر تھے جو رضائے خداوندی کی ضمانت ہے اور جسے نہ کبھی زوال ہے اور نہ فنا۔

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بہ عشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

اِسلام میں مرکزیّت کی اہمیّت

کوئی قوم اس وقت تک اپنی مستقل ہستی قائم نہیں کر سکتی جب تک اس میں کسی نہ کسی قسم کی مرکزیت نہ پائی جائے۔ اسلام نے اس مرکزیت کے تصوّر کو جس قدر اہمیت دی ہے وہ اسی سے ظاہر ہے کہ اس کی تمام اصولی اور فرعی تعلیمات میں مرکزیت کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ سب سے پیشتر اسلام اس اعتقاد میں مرکزیت کی روح پھونکتا ہے جس پر انسان کی مادّی اور روحانی زندگی کی پوری عمارت قائم ہے۔ یعنی "ایک خدا" کا عقیدہ۔ یہ خیال کی سب سے پہلی مرکزیت ہے جس کی اسلام نے تعلیم دی ہے۔ اور ساری دنیا میں صرف اسلام ہی وہ دین ہے جس نے توحید کے عقیدہ کی اس شدت اور جامعیّت کے ساتھ تعلیم دی ہے جس کی کوئی دوسری مثال نہیں ملتی۔ مسلمان کی ساری عبادتوں اور دوسرے تمام کاموں کا صرف ایک ہی مرکز ہے جس کی مرضی اور مشیّت اس کے ہر عمل اور ہر تصوّر پر چھائی ہوئی ہے اور وہ اللہ کی ذات ہے۔

قرآن کریم کا ارشاد ہے: قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ لَا شَرِیْکَ لَهٗ وَبِذٰلِکَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ (آخر سورۂ انعام) اے رسول تم لوگوں سے کہدو کہ میری نماز، میری عبادت، میرا جینا، میرا مرنا سب خدا ہی کے لئے ہے جو سارے جہان کا پروردگار ہے اور اس کا کوئی شریک نہیں اور مجھے اسی کا حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلے اسلام لانے والا ہوں۔ سورۂ آل عمران میں پہلی آسمانی کتابوں کے ماننے والوں سے خطاب ہے: قُلْ یٰۤاَهْلَ الْکِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰی کَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ اے رسول کہو اے اہل کتاب! آؤ ہم تم اس بات پر متحد ہو جائیں کہ ہم خدائے برحق کے سوا کسی اور کی عبادت نہ کریں۔ یہ اور اسی طرح کی کثیر آیات میں افعال و اعمال اور نیت و ارادہ کی اس عظیم مرکزیت کی تعلیم دی گئی ہے جس کو تسلیم کئے بغیر کوئی شخص بھی اسلام کے دائرہ میں قدم نہیں رکھ سکتا اور نہ اس کا کوئی عمل اسلامی کہے جانے کا حق رکھتا ہے۔

اس بنیادی سب سے بڑی مرکزیت کے بعد اب اس کے آگے اسلام نے جو کچھ بھی کہا ہے اور جس بات کی بھی تعلیم دی ہے اس میں ہر جگہ مرکزیت کا یہی مفہوم نظر آتا ہے اور ظاہر ہے کہ

جب پہلے ہی قدم پر ہر دل کا رخ ایک ہی طرف ہوگا اور ہر نگاہ ایک ہی سمت میں اٹھے گی تو زندگی کی دوسری راہوں پر بھی یہی مرکزیت اور یکسانیت قائم رہے گی اور جتنی شدّت کے ساتھ اس پہلی مرکزیت کا ظہور ہوگا، اتنی ہی قوّت اور مضبوطی اُس کے تحت جتنی بھی مرکزیتیں ہونگی اُن سب میں پائی جائے گی۔

اسلام کے علاوہ دوسرے حلقوں سے بھی اس مرکزیت یعنی توحید کا اعلان کیا گیا تھا لیکن جب اس دعوے کی چھان بین کی جاتی ہے تو یہ بات پوری طرح سامنے آجاتی ہے کہ اسلام نے جس توحید کی تعلیم دی ہے اس سے زیادہ مکمل اور جامع نظریۂ توحید ممکن ہی نہیں ہے۔ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے اُسے اپنے اِسلامی نصاب تعلیم کا پہلا سبق اور اپنے روحانی سلسلۂ درس کی سب سے اہم بنیاد قرار دیا ہے۔ قرآنِ کریم نے بھی جس طرح اس مرکزی تعلیم یعنی توحید اور خدا کے وجود کی عظمت کو بار بار تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔ اور بدلے ہوئے انداز اور مختلف طرز اور طریقوں سے اس کی پورے قرآنِ مجید میں سیکڑوں مقامات پر تشریح کی ہے اس کی مثال دوسری قوموں کی کتابوں میں کہیں بھی نہیں ملتی اس نظریہ کی شدّت کا اندازہ اس آیۂ کریمہ سے بھی آسانی کے

ساتھ کیا جا سکتا ہے : اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ (سورۂ نساء ۴۸) یقیناً خدا اس گناہ کو معاف نہیں کرے گا کہ اس کا کسی کو شریک بنایا جائے۔ اس شرک کے گناہ کے علاوہ خدا ہر ایک شخص کے جس گناہ کو چاہیگا معاف کر دیگا۔ اسلام نے اس "شرک" کے ہر ممکن پہلو پر نظر رکھی ہے اور اس کے اثرات کو انسان کے تصوّر و اعمال سے مٹانے کی بھرپور کوشش کی ہے تاکہ ان کی مرکزیت میں کسی رخ سے بھی کوئی فرق نہ آسکے۔ اس کے ساتھ ہی اسلام کا مقصد اور پیغمبر اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی بعثت کی غرض یہ نہیں ہے کہ صرف نظریہ اور تخیّل کی حدوں میں انسان محدود رہے بلکہ اس مقصد کی تکمیل صرف اسی وقت ہوگی جب انسان کا تصوّر اور اعمال دونوں شرک کے ہر رخ سے پاک و صاف ہوں گے اور وہ ایک مکمّل مرکزیت کے پابند ہو جائیں گے جس کا نام "توحید" ہے یہ صرف اس کے لیئے کہ اسلام مسلمانوں کو محض تخیّلی اور نظریاتی قوم نہیں بنانا چاہتا بلکہ انھیں ایک زندہ قوم بنانا چاہتا ہے۔ اُن میں جدّوجہد اور سعی پیہم کی روح پھونکنا چاہتا ہے اور اُن کو ساری دنیا کی پیشوائی کے لیئے نمونۂ عمل قرار دینا چاہتا ہے۔

اسی وجہ سے اُس نے مسلمانوں کو ہر تعلیم سے پہلے اس سب سے بڑی مرکزیت کے راز سے آگاہ کیا اور توحید کا سبق دیا تاکہ ان کے ذہن سے انتشار دور ہو جائے۔ وہ مختلف دروازوں سے اپنا سر ٹکرائیں اور سب کے سب ایک ہی راستہ پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہیں اور قیادت کی تقسیم سے قوموں کی تنظیم کو جو خطرے اور نقصانات پہنچتے ہیں اُن سے وہ پوری طرح محفوظ رہیں۔ اسی بنیادی مرکزیت کی ہر اسلامی تعلیم میں پوری جھلک پائی جاتی ہے۔ نبوّت و رسالت بھی اسی مرکزیت کے تحت ایک دوسرا قدم ہے اور نبی و رسول بھی اُسی ایک مرکز اور اُسی واحد شخص کا نام ہے جو احکامِ الٰہی کا امین ہوتا ہے اور جو اُس پوری قوم کی ہدایت اور قیادت کا ذمّہ دار ہوا کرتا ہے جس کی طرف اُس کی بعثت ہوتی ہے۔ کوئی قبیلہ ہو، کوئی نسل ہو کسی مُلک کے رہنے والے ہوں اور کسی طبقہ اور رنگ سے تعلق رکھتے ہوں رسول اور نبی اُن سب کے لیئے بغیر کسی امتیاز کے رہنمائی حاصل کرنے کا واحد مرکز ہوتا ہے اور یہی غیر منقسم مرکزیت ہی تھی جس نے مسلمانوں کے رگ و ریشہ میں عمل اور نظم و ضبط کی ایک نئی روح پیدا کر دی تھی اور حجاز کے چند مُفلس مسلمانوں کو جنکی تعداد انگلیوں پر گنی جاتی تھی ساری دنیا کے لیئے نمونۂ عمل

اور مثال بنا دیا تھا۔ اسلام نے اس طرح اپنی ہر تعلیم کے ذریعہ انسان کے ذہنی انتشار کو دور کیا ہے اور اُسے مرکزیت کی اہمیت بتائی ہے۔

جہاد: جس پر قوم کے مال اور جان کے تحفظ اور بقا کا دار و مدار ہے اُس وقت تک ممکن ہی نہیں ہے جبتک قیادت میں ایک مستحکم اور انتہائی مضبوط مرکزیت نہ ہو۔ صحیح مسلم کی روایت ہے، اگر ایک حبشی غلام بھی تمہارا امیر بنا دیا جائے اور وہ تمہیں کتاب خدا کے مطابق عمل کرنے کا حکم دے۔ فَاسْمَعُوْا لَہٗ وَاَطِیْعُوْا۔ تو تم اس کی اطاعت کرو اور اس کے حکم پر چلو۔

نماز: جو تمام عبادتوں سے افضل عبادت ہے اس میں بھی قدم قدم پر مرکزیت کی عملی تعلیم موجود ہے۔ زمین کے کسی حصّہ میں بھی کوئی کیوں نہ ہو لیکن جب نماز پڑھے گا تو اس کا رخ ایک ہی مرکز کی طرف ہوگا یعنی کعبہ کی طرف۔ ان نماز کے پڑھنے والوں میں قبیلہ، رنگ اور نسل یا ملک اور خطّہ کی کوئی بھی قید نہیں ہے۔ وہ کہیں بھی ہوں لیکن جب سر جھکائیں گے تو مکّہ ہی کی طرف جھکائیں گے۔ اس لیئے کہ وہ جانتے ہیں کہ اسلام میں رنگ و نسل و خاندان کا کوئی سوال ہی نہیں ہے اور جتنے مسلمان بھی اس زمین پر رہتے ہیں وہ سب ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔

اور اُن کا اسلام جغرافیائی حدوں کا پابند نہیں ہے۔

پھر اگر نماز جماعت سے ادا کی جائے تو اس کا مرکز بھی ایک ہی ہوتا ہے۔ یہ بھی مرکزیت کی زندہ مثال ہے۔ واحد امامت کرنے والے اور ایک مرکز کے بغیر جماعت نہیں ہو سکتی جس کے ہر اشارہ کے مطابق تمام نمازی جو اُس کے پیچھے نماز پڑھ رہے ہیں حرکت کرتے ہیں۔

حج : کا بھی ایک ہی مرکز ہے جس کے بغیر حج نہیں ہو سکتا یعنی کعبۂ مکرمہ یہی مرکزیت اسلامی تعلیم کی روح ہے اور اسی مرکزیت سے مسلمانوں کو دنیوی عروج حاصل ہوا۔

اسی مرکزیت کے تصوّر نے اُن کے دل و دماغ سے خطّہ اور رنگ و نسل کی تفریق کو مٹا کر ہمیں ایک غیر منقسم اور واحد شخصیت میں تبدیل کر دیا۔ یہ مرکزیت اسلامی زندگی کا ایک عظیم ستون ہے اس کی اہمیت اور ضرورت سے مسلمان جتنے زیادہ واقف ہوتے جائیں گے، اسی حد تک وہ آگے بڑھیں گے اور ناقابل تسخیر طاقت بنتے چلے جائیں گے۔

گروہ بندی

گروہ بندی کی بنیاد ہمیشہ کسی ذاتی یا جماعتی تعصب پر ہوا کرتی ہے اس کا تعلق اس بات سے نہیں ہوتا کہ حق اور انصاف کس کے ساتھ ہے کون صحیح راستہ پر ہے اور کون غلط راہ پر ہے۔

گروہ بندی کا واحد مقصد یہی ہوتا ہے کہ اپنی جماعت اور اپنے گروہ کی حمایت کی جائے چاہے وہ کتنے ہی غلط نقطۂ نظر کا حامل ہو۔

اگر کسی جماعت کا مقصد درست ہو تو وہ یقیناً اس کی حقدار ہے کہ اپنے اس مقصد کی حمایت کرے اور دنیا کی کوئی طاقت اس کے اس حق سے اسے محروم کرنے کا حق نہیں رکھتی لیکن جہاں تک "گروہ بندی" کے مفہوم کا تعلق ہے وہ اس سے بالکل مختلف چیز ہے اس کا مقصد تو صرف یہ ہوتا ہے کہ اپنی ہی جماعت اور اپنی ہی پارٹی کی حمایت اور طرفداری کی جائے۔ اسکی نظر اس جانب ہوتی ہی نہیں کہ انصاف کیا چاہتا ہے اور حق کس طرف ہے

اس لیئے "گروہ بندی" یقیناً ایک آزاد معاشرہ کی ترقیوں میں بڑی رکاوٹ ہے اور انسانی ارتقاء و تمدن کے لیئے ایک لعنت ہے کیونکہ اس کی بنیاد تعصّب پر ہوتی ہے اور تعصّب میں اچھے اور بُرے کا امتیاز نہیں ہوتا، حق و ناحق کی تفریق نہیں ہوتی اور صحیح و غیر صحیح میں فرق نہیں کیا جاتا۔ اسلام نے جس اجتماعی زندگی اور جن تمدنی قدروں کی تعلیم دی ہے اُن میں "گروہ بندی" کے تصوّر کی کوئی گنجائش ممکن نہیں۔

رسول اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلّم کی سیرت پاک، اسلامی تاریخ کے ابتدائی دور کے واقعات، قرآن کریم کی حکیمانہ تعلیم اور بزرگان اسلام کے ارشادات، ان کی سیرت اور ان کا کردار ہمیں یہی سکھاتا ہے کہ ہم ایک دوسرے کے ساتھ تعاون تو کریں مگر اس کی بنیاد اخوت و یگانگت، برادری اور خلوص پر ہو اور پھر ان تمام باتوں کی بنیاد انصاف پر ہو، عدل پر ہو اور سچائی پر ہو۔ قرآن کریم کا اعلان ہے:۔

"وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ"
(مائدہ/۲)

نیکی اور پرہیزگاری میں تو ایک دوسرے کیساتھ تعاون کرنا

مگر دیکھو برائیوں میں، ظلم میں اور گناہ کے کاموں میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرنا۔ اس سے یہ بات پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام جس اخوت، تعاون اور باہمی یگانگت واتحاد کی تعلیم دیتا ہے وہ وہی ہے جس کی بنیاد تقویٰ اور نیکی پر ہو۔

"گروہ بندی" اس سے بالکل مختلف ہے اور قرآنِ کریم کے نظریۂ تعاون کے قطعاً خلاف ہے۔

"گروہ بندی" سے جہاں ظلم و ناانصافی کی ہمت افزائی ہوتی ہے ہٹ دھرمی، ضد اور بے جا دشمنی کی بنیاد پڑتی ہے رحمدلی، عدل و انصاف، خوش اخلاقی اور راست بازی سے نفرت کی تعلیم ملتی ہے۔ ساتھ ہی اقرباپروری، دوست نوازی اور حق کشی کی عادت پڑتی ہے۔ "گروہ بندی" معاشرہ میں تفریق اور باہمی انتشار کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ جس معاشرہ میں یہ لعنت ہوگی اس میں ہمیشہ پھوٹ رہے گی اور وہ ہمیشہ تباہ و برباد رہے گا۔ لوگوں کے حقوق برباد ہوں گے وہ ترقیوں سے محروم کیے جائیں گے۔ اُن کی صلاحیتیں تباہ ہوں گی ان میں اخوت کے بجائے عداوت ہوگی۔ اتحاد کے بجائے افتراق ہوگا اور دوستی کے بجائے دشمنی پیدا ہوگی۔ اس لیے ہر مسلمان کا فرض ہے

کہ وہ "گروہ بندی" کرنے کی کوشش نہ کرے بلکہ ایمانی برادری واتحاد اور حق و انصاف و عدل پر کاربند ہونے کی سعی کرے۔ جناب سرورِ کائنات نے ایک حدیث میں فرمایا ہے :- مَنْ تَعَصَّبَ اَوْ تُعُصِّبَ لَہٗ فَقَدْ خَلَعَ رِبْقَۃَ الْاِیْمَانِ مِنْ عُنُقِہٖ "۔ جو شخص خود تعصّب کرے اور کسی بات یا کسی شخصیت کی بیجا حمایت اور طرفداری برائے طرفداری کرے یا خود اس کی مرضی سے اس کی بے جا حمایت کی جائے اور اس کی خواہش اور رضامندی سے اس کی پچ کی جائے تو یقیناً ایسے آدمی نے ایمان کا حلقہ اپنی گردن سے اتار پھینکا ہے اور اب ایمان سے اس کا کوئی رشتہ باقی نہیں رہا۔ اس حدیث مبارک کا مطلب کس قدر واضح ہے یعنی "گروہ بندی" "پارٹی بندی" بے جا حمایت اور طرفداری یا کسی مسئلہ میں خواہ وہ ذاتی ہو قومی ہو یا ملکی ہو اور انسانی زندگی کے کسی شعبہ اور کسی پہلو سے تعلق رکھتا ہو۔ کسی کی پچ کرنا، تعصب کرنا، ناحق طرفداری کرنا، روح ایمانی کو فنا کر دیتا ہے، اسلام کے مقصد کو مٹا دیتا ہے۔ اسلامی تمدن تہذیب اور اس کے مقصد اور تصوّر زندگی پر ضرب لگاتا ہے جو رسولِ بطحا نے اپنی عدیم المثال زندگی اور اپنے مثالی کردار سے

سے پیش کیا تھا اور جو قانون اسلام کی آسمانی کتاب قرآن مقدس و مکرم نے انسانیت کو سکھایا تھا۔

یعنی ایک دوسرے کی حمایت کرے تو ہر ایک کا فرض اولین ہے کہ پہلے اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرے کہ اُس کی یہ حمایت اور یہ طرفداری بے جا تو نہیں ہے۔ کہیں اس حمایت اور جماعت سازی سے اسلام و ایمان کی روح تو زخمی نہیں ہوتی۔ کہیں اس بے جا حمایت سے اللہ اور اس کی مخلوق کے حقوق تو پامال نہیں ہوتے۔ کہیں اس طرفداری سے وقتی سکونِ قلب، وقتی اطمینان اور وقتی و عارضی طور پر دل کی تمنّا تو پوری نہیں ہو رہی ہے اور اس کے نتیجہ میں افراد یا معاشرہ کا کوئی عظیم نقصان، انسانی برادری کے لیئے کوئی تباہ کن مستقبل تو پیدا نہیں ہو رہا ہے یا اس گروہ بندی کی پر بہار اور کیف آور فضا کے پردوں میں کسی بڑی آگ کے شعلے تو پوشیدہ نہیں ہیں جو اس وقتی خوشی کے بعد سارے معاشرہ کو خاکستر کا ڈھیر بنا دیں۔ قرآن کریم نے اسی عظیم خطرہ کے پیش نظر یہ ارشاد کیا تھا:۔ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا ط اِعْدِلُوْا ھُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی۔ (مائدہ/۸)

کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی جماعت کی دشمنی تم کو اس جرم

میں پھنسا دے کہ تم ناانصافی کرنے لگو بلکہ تم ہر حال میں انصاف اور عدالت سے کام لو یہی بات پرہیزگاری سے بہت قریب ہے۔"
حضرت پیغمبر اسلام کا ارشاد ہے :۔ اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ النَّاسُ مِنْ لِسَانِہٖ وَیَدِہٖ"۔ حقیقی مسلمان تو وہ ہے جس کی زبان اور جس کے ہاتھ سے لوگ محفوظ رہیں۔

ایک دوسری حدیث میں فرمایا گیا ہے :۔ لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یُحِبَّ لِلنَّاسِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ۔
کوئی مؤمن ہو ہی نہیں سکتا، جبتک وہ اور لوگوں کے لیئے وہی نیک باتیں پسند نہ کرے جو اپنے لیئے پسند کرتا ہو۔
قرآنِ کریم نے حضرتِ یعقوبؑ کی اولاد کی پارٹی بازی اور گروہ بندی کی طرف " وَنَحْنُ عُصْبَۃٌ " فرماکر اشارہ کیا ہے اور اس کی شدید مذمت کی ہے۔ اسلام کا نظریہ صرف یہ ہے :۔
(آلِ عمران) وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعاً وَّلَا تَفَرَّقُوْا۔ رشتۂ الٰہی کو مضبوط تھامے رہو اور اپنے آپس کے اتحاد کو نقصان نہ پہنچاؤ اور انتشار نہ پھیلاؤ۔

جزیہ

جس آیۂ کریمہ میں اہل کتاب سے "جزیہ" (ایک مخصوص ٹیکس) لینے کا حکم ہے اور علماء نے اس کی تشریح میں تفصیلی بحث کی ہے کہ اہل کتاب میں کون کون قومیں شامل ہیں وہ حسب ذیل ہے:۔

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ۔" (پارہ ۱۰ رکوع ۱۰ سورۃ التوبہ آیت ۲۹)

جزیہ سے مراد وہ ٹیکس ہے جو اسلامی حکومت اپنی غیر مسلم رعایا سے ان کی جان و مال کی حفاظت کے معاوضہ میں وصول کرتی ہے۔ جن لوگوں سے یہ ٹیکس وصول کیا جاتا ہے وہ ذمّی کہلاتے ہیں۔

یہ تین قومیں ہیں۔ یہودؔ، نصاریٰؔ اور مجوسیؔ - اور ان ہی کو اہل کتاب کہا جاتا ہے۔ مجوسیوں کے اہل کتاب میں داخل ہونے پر علماء اسلام میں اختلاف ہے۔ بعض انہیں اہل کتاب میں شامل جانتے ہیں اور بعض شامل نہیں سمجھتے ائمہ اہل بیت اطہار علیہم السلام سے کچھ حدیثیں منقول ہیں جن میں ان کو اہل کتاب کہا گیا ہے۔

تفسیر صافی ج اوّل صفحہ ۲۵۴ پر اصول کافی سے ایک تفصیلی حدیث امام جعفر صادق سے منقول ہے جس میں امامؑ نے وضاحت کے ساتھ کہا ہے کہ حضرت رسولِ اسلامؐ نے اہل مکّہ کو لکھا تھا کہ مجوس کا ایک صاحبِ کتاب نبی تھا اور یہ لوگ اہل کتاب ہیں۔ دوسری حدیث حضرت علیؑ سے منقول ہے جو حسبِ ذیل کتابوں میں مذکور ہے :-

تفسیر فتح البیان ج ۴ ص ۸۹ - مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج ۸ ص ۶۷ - تفسیر خازن ج ۳ ص ۸۰-

- التہذیب للطوسی ج اوّل ص ۲۴۹-

اس حدیث میں بھی اس کی تصریح ہے کہ مجوس اہل کتاب میں داخل اور شامل ہیں - اور ان کا ایک نبی تھا

جو صاحب کتاب تھا۔

اور جو لوگ مجوسیوں کو اہل کتاب میں شامل نہیں سمجھتے وہ سب اس بات پر متفق ہیں کہ رسول اللہ نے اُن کے ساتھ "جزیہ" کے معاملہ میں اہل کتاب ہی کا سا برتاؤ کیا اور دوسروں کو بھی اسی طرح کا برتاؤ کرنے کا حکم دیا ہے چنانچہ حسبِ ذیل حدیثیں اس سلسلہ میں موجود ہیں :۔

(بخاری ج اول ص ۴۴۷) عبد الرحمٰن بن عوف نے خلیفۂ ثانی عمرؓ بن الخطاب سے بیان کیا کہ رسول اللہ نے ھَجر (بحرین کا مشہور شہر) کے مجوسیوں سے "جزیہ" لیا تھا (جبکہ حضورؐ نے اہل کتاب کے علاوہ کسی دوسرے غیر مسلم سے "جزیہ" نہیں لیا تھا۔ رضی)

اس کے بعد دوسری روایت ہے :۔ رسول اللہ نے ابوعُبیدہؓ بن الجراح کو "بحرین" روانہ کیا تھا تاکہ وہ وہاں کے باشندوں سے "جزیہ" حاصل کریں (جبکہ بحرین ایران کا علاقہ تھا اور وہاں کے لوگ زیادہ تر مجوسی تھے۔ رضی)

اسی مقام پر بخاری میں یہ بھی لکھا ہے کہ رسول اللہ نے

بحرین والوں سے صلح کرلی تھی اور وہاں علاءؓ بن حضرمی کو گورنر بنادیا تھا۔ حاشیہ نمبر ۵ پر لکھا ہے کہ عمرؓ بن الخطّاب نے عبدؓ الرحمٰن بن عوف کی گواہی پر کہ رسوؐل اللہ نے مجوسیوں سے "جزیہ" لیا تھا۔ خود بھی اُن سے "جزیہ" لینا شروع کردیا۔ پھر حاشیہ نمبر ۶ پر ہے کہ اہل بحرین سے صلحنامہ ۹ھ میں ہوا تھا (بخاری ج اوّل ص ۴۴۔)

تفسیر فتح البیان ج ۴ ص ۸۸): قال ؑ: سُنّوا بِهِم سُنَّةَ اَہلِ الکتابِ اَخرجہ البخاری۔ رسوؐل اللہ نے فرمایا کہ مجوسیوں کے ساتھ اہل کتاب کا سا معاملہ کرو۔ پھر ص ۸۹ پر وہی تفصیل ہے جو ابھی ذکر ہوئی۔

ابوداؤد ج ۲ کتاب الخراج ص ۱۳۴ پر بھی عبدؓ الرحمٰن بن عوف کی روایت کا ذکر ہے اور حاشیہ نمبر ۸ پر "مؤطاء" کی روایت مندرج ہے۔ عبدؓ الرحمان بن عوف نے کہا میں گواہی دیتا ہوں کہ رسوؐل اللہ نے فرمایا۔ سُنّوا بِهِم سُنَّةَ اَہلِ الکتابِ۔ پھر حاشیہ نمبر ۹ پر ہے: "شرح السُّنّة" میں ہے کہ علماء کا اس بات پر اجماع ہے کہ مجوسیوں سے "جزیہ" لیا جاسکتا ہے۔

شرائع الاسلام صـ ۷۶ - " اہلِ کتاب سے مراد یہود، نصاریٰ اور مجوس ہیں -

شرح لُمعہ صـ ۸۷ پر و صـ ۸۱ پر بھی مجوس کو اہلِ کتاب میں شامل کیا گیا ہے - تہذیب الاحکام کتاب الزکوٰۃ پر بھی یہی ہے -

ترمذی صـ ۲۴۸ (باب اخذ الجزیہ من المجوسی) پر بھی عبدؓ الرحمان بن عوف کی روایت ہے - تفسیر خازن ج ۳ صـ ۸۰ پر حضرت علیؓ کی روایت اور دوسری روایات موجود ہیں - اسی طرح تفسیر بغوی ج ۳ (برحاشیہ خازن جلد ۳) صـ ۸۰ پر بھی یہی ہے - صـ ۸۰ سطر ۲۰ پر ذبائح و مناکحت کی حُرمت کا ذکر ہے -

پھر صـ ۸۱ پر ہے کہ "جزیہ" کی غرض اُن کی جان و مال کی حفاظت کا ٹیکس ہے -

مُرقاۃ شرح مِشکوٰۃ ج ۸ صـ ۶۶/۸۷ پر حضرت علیؓ کی روایت بھی ہے اور مجوسیوں پر اسی قسم کی پوری بحث ہے - اور یہ بھی لکھا ہے کہ علماء کی اکثریت مجوسیوں کو اہلِ کتاب نہیں مانتی مگر حکمِ جزیہ پر سب کا اتفاق ہے -

تفسیر روح المعانی ج ۱۰ ص ۷۹ پر ہے کہ مجوسیوں سے جزیہ لیا جاسکتا ہے اور وہ تمام بحث ہے جو دوسری کتابوں میں ہے اور یہ لکھی ہے کہ عورت، بچہ، اپاہج، اندھا، مفلوج، بوڑھا، فقیر، غلام، راہب۔ اس حکم "جزیہ" سے مستثنیٰ ہیں۔

تفسیر کبیر از علامہ رازی ج ۱۴ میں ۔۔۔ لکھی سُنُّوبِهِم الحدیث کا ذکر ہے۔

مُعجَمُ البُلدان حموی جلد اوّل ص ۳۴۸ پر "بحرین" کی تحقیق میں لکھا ہے:

سنہ ۸ھ میں رسول اللہ نے علاء بن عبد اللہ الحضرمی کو بحرین روانہ کیا تھا کہ وہ مجوسیوں کو دعوت اسلام دیں یا اُن سے جزیہ لیں وہاں پہنچ کر علاء نے ان لوگوں سے مصالحت کرلی۔ صلحنامہ کی عبارت یہ تھی: هٰذَا مَا صَالَحَ عَلَيْهِ الْعَلَاءُ بْنُ الْحَضْرَمِيِّ أَهْلَ الْبَحْرَيْنِ صَالَحَهُمْ عَلَىٰ أَنْ يَكْفُونَا الْعَمَلَ وَيُقَاسِمُونَا التَّمْرَ فَمَنْ لَا يَفِي بِهٰذَا فَعَلَيْهِ لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِيْنَ۔

مجوس اور ان کے علاوہ بحرین میں جو یہود و نصاریٰ ہیں وہ بدستور کام کاج کریں گے یعنی زراعت و تجارت وغیرہ

اور جو فائدہ حاصل ہوگا اس سے ہمارا حصّہ ادا کریں گے الخ۔ (یہ حصّہ نصف ہوگا) رسُول اللہ نے ھَجَر (بحرین) کے مجوسیوں سے جزیہ لیا تھا اور عمرؓ نے ایران کے مجوسیوں سے لیا۔ پھر جس قدر دولت رسُولؐ اللہ کو بحرین کے مجوسیوں سے ملی کسی سے نہ ملی تھی۔

اسلام کا نظریۂ ملکیت حصّہ دوم از ڈاکٹر محمد نجات اللہ صدیقی صـ ۸۰ پر ہے:

"جزیہ" سے مراد وہ ٹیکس ہے جو ذمیوں سے ان کی جان و مال کی حفاظت کے لیئے وصول کیا جاتا ہے۔ یہ ٹیکس ایسے مردوں پر لگایا جاتا ہے جو فوجی خدمت کے قابل ہوں۔ عورتیں اور بچے اس سے مستثنیٰ ہیں۔ اسی طرح بوڑھے، مسکین اور غریب اور وہ اندھے، لنگڑے اور اپاہج بھی مستثنیٰ ہیں جو مال نہیں رکھتے۔ نادار مذہبی پیشواؤں کو بھی اس سے مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ یہ ٹیکس اشخاص کی حیثیت کے مطابق لگایا جائے گا۔ اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے حقوق صـ ۳۷ از امین احسن اصلاحی)

اگر ذمی غیر مسلم بھی فوجی خدمت کے لیئے آمادہ ہوں اور

(اسلامی) ریاست اُن پر اعتماد کر سکتی ہو تو انھیں "جزیہ" سے بری کیا جا سکتا ہے (الخراج فی الدولۃ الاسلامیہ صہ ۱۱۱)۔

جُرجی زیدان کی "التمدن الاسلامی" ج اوّل صہ ۲۲۷

(ترجمہ) جزیہ اسلام کی ایجاد نہیں ہے بلکہ یہ قدیم زمانہ سے رائج تھا۔ چنانچہ پانچسو سال قبل مسیح یونانی حکومت نے ایشیائے کوچک کے ساحلی باشندوں پر جزیہ مقرر کیا تھا۔ جبکہ ان کی لڑائی فینیقیوں سے ہو رہی تھی (یہ ٹیکس فوجی خدمات سے استثنار کی بنا پر تھا) اسی طرح رومیوں نے اپنی رعایا پر اسی طرح کا فوجی ٹیکس لازم کیا تھا اور وہ ٹیکس (جزیہ) مسلمانوں کے نافذ کردہ جزیہ سے بہت زیادہ تھا۔ (آگے تفصیل ہے) جو تقریباً اسلامی جزیہ سے سات گنا زیادہ تھا۔

ایرانی گورمنٹوں نے بھی اپنی رعایا پر جزیہ مقرر کر رکھا تھا۔ چنانچہ ابن اثیر نے (کامل میں) اس کی تصریح کی ہے۔ تو بظاہر مسلمانوں میں "جزیہ" اُن کے پڑوسی ملک ایران ہی سے آیا ہے۔ معنوی اور لفظی دونوں حیثیتوں سے ۔

یعنی یہ فوجی خدمت سے استثناء کا ٹیکس ہے اور فارسی زبان میں اس کو "گزیت" کہا جاتا ہے جو معرّب ہو کر "جزیہ" کہا جانے لگا۔

"جزیہ" کی شرح ۱۲ درم سالانہ سے لے کر ۴۸ درم سالانہ تک تھی۔ عورت، بچے، بیمار، معذور، بڈھے، بے روزگار، مذہبی طبقہ (مثلاً پادری، جوگی) غلام وغیرہ مستثنیٰ تھے۔

عام طور پر (یعنی مصالحتی جزیہ کے علاوہ) جو جزیہ لیا جاتا تھا وہ یہ تھا۔ تقریباً ایک روپیہ ماہانہ امیروں سے، متوسط لوگوں سے ۸؍ ماہانہ عام لوگوں سے ۴؍ ماہانہ۔ درمیان سال اگر کوئی مر جاتا تھا تو اس سے "جزیہ" ساقط کر دیا جاتا تھا۔ (اسلامی معاشیات از مناظر احسن گیلانی) روم اور ایران کی رعایا کو مسلمانوں کی حکومت میں آ جانے کے بعد جو رقم جزیہ دینا پڑتی تھی وہ اس رقم سے بہت کم ہوتی تھی جو انھیں پہلی حکومتوں کے وقت دینا پڑتی تھی۔

(نوٹ) حضرت سلمانؓ فارسی۔ اصفہان کی آتش پرست (مجوس) قوم سے تعلق رکھتے تھے۔ پھر ایران سے شام میں آ گئے

پھر متوسل ہیں۔ انھوں نے ایرانی، رومی اور یہودی کتابوں کا مطالعہ کیا تھا اور آخر میں مدینہ میں آکر رسولِ اسلام کی خدمت میں مشرف بہ اسلام ہو گئے تھے۔ خندق کی لڑائی جو ۵ھ میں ہوئی تھی اس میں رسول اللہؐ نے ان کے لئے فرمایا تھا، "سَلْمَانُ مِنَّا اَہْلَ الْبَیْتِ" سلمان ہم اہلبیتؑ میں سے ہیں۔

صحابۂ کبار میں ان کا سب سے اونچا مرتبہ تھا۔ ان کی عمر بہت طویل ہوئی۔ (المتوفی ۳۶ھ) الاعلام ج ۳ ص ۱۶۹۔

انہیں بجائے سلمان فارسی کے سلمان محمدی کہا جاتا تھا (سفینۃ البحار ج اول ص ۶۴۶)

علامہ سید محمد رضی مجتہد کی تصنیفات

شہادتِ کبریٰ: (حصّہ اوّل و حصّہ دوم و حصّہ سوم) شہادت کبریٰ۔ حصّہ اوّل کی بہت کم جلدیں رہ گئی ہیں کتب فروشوں کو معقول کمیشن دیا جاتا ہے کتب فروش جلد توجہ دیں ورنہ دوسرے اڈیشن کا انتظار کرنا ہوگا۔ حصّہ دوم زیر کتابت ہے اور حصّہ سوم کا مسودہ ترتیب دیا جا رہا ہے۔ کاروباری سہولت کا خیال رکھا جاتا ہے

درسِ قرآن حصّہ اوّل و حصّہ دوم

حصہ اوّل کا دوسرا اڈیشن اور حصّہ دوم کا پہلا اڈیشن طبع ہو گیا کاغذ عمدہ چکنا سفید 20×26/8 عبارت سلیس انداز دلنشیں! دُنیوی و اُخروی کامیابیوں کے راز سے واقف ہونے کے لئے ضروری ہے کہ آپ درسِ قرآن کا مطالعہ کریں۔ کتب فروشوں کو معقول کمیشن کے ساتھ دیگر کاروباری سہولتیں دی جاتی ہیں۔ جلد توجہ دیجئے!

خطبات حصّہ اول، حصّہ دوم حصہ سوم، حصّہ چہارم اور حصّہ پنجم

علامہ موصوف کی ان سینکڑوں تقاریر کا مجموعہ ہے جو انھوں نے ریڈیو پاکستان اور ٹیلیویژن سے نشر کی ہیں اور جن سے کرۂ ارض کے کروڑوں تشنگانِ علم و ادب سیراب ہوتے رہے ہیں ان خطبات کی افادیت اور مقبولیت کا سکہ پوری دنیا پر جما ہوا ہے۔ کاغذ چکنا سفید ۲۰×۳۰/۱۶ ہر حصہ میں تقریباً ۴۰۰ صفحے۔ کتب فروش جلد متوجہ ہوں کمیشن معقول ملیگا

پتہ:- ادارہ نشر علوم دینیہ ۹۶ سی بلاک نمبر ۱۰ فیڈرل بی ایریا۔ کراچی

فون نمبر:- 683025